طلوع اسلام

جنوری ۱۹۵۴

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ

1. تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے [illegible] وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔
2. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے [illegible] پہنچ سکتی۔
3. حق و باطل کا معیار قرآن ہے [illegible] جو قرآن کے مطابق ہے [illegible] خلاف ہے [illegible]
4. حضور نبی اکرم [illegible] کہ دین کا معیار خود قرآن کریم ہے۔
5. قرآن کی رو سے [illegible] ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔
6. اس نظام [illegible] زندگی کی تشکیل [illegible] قرآن کے اصول [illegible] غیر متبدل رہیں گے۔
7. اس نظام [illegible] قرآن [illegible]
8. ربوبیت [illegible] قرآنی نظام ربوبیت کہا جاتا ہے [illegible] اٹھے۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک و مقصد سے متفق ہیں [illegible]

دس آنے

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی)	سعید احمد	سالانہ چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ

جلد ۷	جنوری ۱۹۵۴ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

قرآن نے کیا کہا؟	۴
لمعات	۵-۱۰
سلیم کے نام (محترم پرویز صاحب)	۱۱-۱۹
حلقۂ معاونین طلوع اسلام	۲۱
عہد نبویؐ میں قرآن مجید کی تدوین و ترتیب (مولانا سید بدرالدین صاحب علوی)	۲۲-۴۴
تنقید مضامین احادیث نزول عیسیٰؑ (علامہ تمنا عمادی)	۴۵-۶۴
طلوع اسلام ہفتہ وار	۶۴
رفتارِ عالم	۶۵-۷۳

قرآن نے کیا کہا؟

دنیا میں ہر قوم غلبہ و اقتدار چاہتی ہے۔ ہر قوم کی یہ خواہش ہے کہ وہ دوسری قوموں پر غالب آجائے اور قوت و اختیار اس کے ہاتھ میں رہے۔ اس کیلئے کوئی قوم اپنی صنعت و حرفت کو ترقی دیتی ہے تاکہ دوسری قومیں اسکی مصنوعات کی محتاج رہیں اور اس طرح اُن کی دولت اِن کے ملک میں آتی چلی جائے۔ کوئی قوم دنیا کے مختلف حصوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کرتی ہے تاکہ وہ اس کے لئے منڈیوں کا کام دے۔ کوئی قوم بساطِ سیاست کی مہرہ بازیوں میں ید طولیٰ حاصل کرتی ہے تاکہ وہ اس قمارخانے میں دوسری قوموں کی بازی مات کردے۔ کوئی قوم تخریبی اسلحہ اور ایٹم بم کی خفیہ طاقتیں ایجاد کرتی ہے تاکہ باقی اقوامِ عالم اس سے خائف و مرعوب رہیں۔ یہ سب طریقے وقتی طور پر مؤثر ثابت ہو جاتے ہیں۔ یہ زندگی کی حیوانی سطح سے متعلق ہیں۔ انسانیت کی سطح پر ان کی کوئی قیمت نہیں۔

ان کے مقابلہ میں قرآن کہتا ہے کہ من کان یرید العزۃ۔ جو قوم دنیا میں غلبہ و اقتدار چاہتی ہے اسے یاد رکھنا چاہئے کہ للہ العزۃ جمیعاً۔ صحیح غلبہ و اقتدار صرف خدا کے قانون کی پابندی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ اس قوم کی تہذیب و تمدن کی بنیادیں ایک ایسے نظریۂ زندگی اور تصورِ حیات (IDEOLOGY) پر ہونی چاہئیں جس میں بڑھنے، پھولنے، پھلنے اور نوعِ انسانی کے لئے خوشگوار نتائج پیدا کرنے کی صلاحیت ہو۔ یہی تصورِ حیات ہے جو بلندیوں کی طرف اُٹھ سکتا ہے۔ الیہ یصعد الکلم الطیب۔ لیکن یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ایک خوشگوار نظریۂ حیات خود بخود بلندیوں کی طرف اُٹھ جاتا ہے اور اپنی حامل قوم کو یونہی عروج تک پہنچا دیتا ہے۔ والعمل الصالح یرفعہٗ۔ اس نظریہ کو ہمواریاں پیدا کرنے والی، صلاحیت بخش جدوجہد اوپر کو اٹھاتی ہے۔ لہٰذا غلبہ و اقتدار حاصل کرنے کیلئے خوشگوار نظریۂ حیات اور اس کے ساتھ ہمواریاں پیدا کرنے والی جدوجہد دونوں کی ضرورت ہے۔

اس کے برعکس جو قوم معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے والی تدبیریں کرے گی (والذین یمکرون السیئات) تو ان کا انجام تباہی اور بربادی ہوگا اور ان کی یہ تدبیریں اور اسکیمیں آخرالامر خاسر و ناکام رہ جائیں گی۔ (ومکر اولئک ھو یبور۔ ۳۵)۔

لہٰذا، قرآن۔ قرآن پکارنے والوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن، غلبہ و اقتدار حاصل کرنے کے لئے کونسا پروگرام تجویز کرتا ہے۔

قرآنی نظریۂ حیات اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا کرنے والی جدوجہد۔
اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

حصول پاکستان کی تحریک کے دوران میں جو لوگ شریعت کے نام پر تشکیل پاکستان کی مخالفت کیا کرتے تھے، ہم ان سے کہا کرتے تھے کہ مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت بن جانے سے اور کچھ بھی نہ ہوا تو کم از کم اس امر کا امکان تو ضرور ہو جائے گا کہ اگر مسلمان چاہیں گے تو وہ قرآن کے مطابق اپنے قوانین بنا لیا کریں گے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی امر کیلئے امکانی قوت یا وسائل کا موجود ہونا ان چیزوں کے نہ ہونے سے بہرحال بہتر ہے۔ لیکن یہ لوگ اس کے باوجود اس کی مخالفت کرتے رہے۔ حالانکہ ان کے پاس اس دلیل کا کوئی جواب نہیں تھا۔

پاکستانی مسلمانوں کی ان امکانی وسعتوں کی ایک زندہ مثال ابھی ابھی ہمارے سامنے آئی جو پیش نظر لمعات کا عنوانِ زرّیں ہے۔ ۵ دسمبر ۱۹۵۳ء کے اخبارات میں یہ خبر سامنے آئی کہ پنجاب اسمبلی میں چودھری محمد اقبال چیمہ صاحب کی طرف سے ایک مسودۂ قانون پیش کیا گیا ہے جس کی رو سے یتیم پوتے کو اپنے دادا کی جائداد سے ورثہ مل سکے گا۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، تشکیل پاکستان کے بعد یہ پہلا موقعہ ہے کہ مجلس قانون ساز میں اس امر کا مسوّدہ پیش ہوا ہے کہ ایک غیر قرآنی قانون کو قرآن کے مطابق بدلا جائے۔ ہم چودھری محمد اقبال چیمہ کو درخورِ ہزار مبارکباد سمجھتے ہیں جنھوں نے اس مسودہ کے پیش کرنے کی جرأت کی۔ ہم پنجاب اسمبلی کے اس اقدام پر اسے سزاوارِ تہنیت قرار دیتے ہیں کہ اس نے اس بل کے پیش کرنے کی اجازت دیدی — معلوم ہوا ہے کہ رائے عامہ سے استصواب کی خاطر اب اس بل کو مشتہر کیا جائے گا۔

یوں تو ہمارے مروجہ (فقہی) قانونِ وراثت میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو قرآن کے بھی خلاف ہیں اور علم و عقل کے بھی خلاف۔ لیکن ان میں یتیم پوتے کی وراثت سے محرومی کا قانون ایسا ہے جس پر قرآنی نصوص پکار پکار کر فریاد کرتی ہیں اور چشم حساس خون کے آنسو روتی ہے۔ معلوم نہیں ہمارے فقہا کو یہ غلطی کیسے لگ گئی کہ انھوں نے اس قسم کا قانون اپنی فقہ میں داخل کر دیا اور اس کے بعد یہ قانون آج تک بطور قانون شریعت رائج چلا آرہا ہے۔ سیدھے سے الفاظ میں بات یوں سمجھئے کہ زید کا بیٹا بکر اور بکر کا بیٹا حامد ہے۔ زید کی زندگی میں اس کا بیٹا بکر فوت ہو گیا۔ ہمارا مروجہ قانونِ فقہ یہ کہتا ہے کہ حامد جو اپنے باپ کی موت کی وجہ سے یتیم ہو گیا ہے اپنے دادا کی جائداد سے کچھ حصہ نہیں پائیگا۔ یہ اس سے محروم رہ جائیگا اور اس کے دادا کی ساری جائداد اس کے دوسرے بیٹے کو مل جائے گی۔ اور اس کے بعد اس کے بیٹوں کو۔ سطحی طور پر دیکھنے سے بھی یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس یتیم پوتے پر یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ایک تو اس بیچارے کا باپ مر گیا اور پھر وہ اپنے دادا کی جائداد سے بھی محروم ہو گیا۔ اگر اس کا دادا ایک گھنٹہ پہلے مرتا اور اس کا باپ ایک گھنٹہ بعد تو اس صورت میں اس پوتے کو دادا کی جائداد مل جاتی۔ لیکن چونکہ اس کا باپ اسکے دادا کی زندگی میں مر گیا ہے اسلئے اسے دادا کی جائداد میں سے کچھ نہیں ملیگا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس قسم کا قانون کبھی خدائی قانون ہو سکتا ہے؟

اس قانون کے خلاف علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی نے ۱۹۱۷ء میں قلم اٹھایا اور "محجوب الارث" کے عنوان سے مجلہ معارف

(اعظم گڈھ) میں ایک مبسوط مضمون شائع کیا جس میں فقہ اور قرآن دونوں سے ثابت کیا کہ یہ قانون کسی طرح سے بھی صحیح نہیں۔ یتیم پوتا اپنے دادا کی وراثت سے محروم نہیں ہو سکتا۔ طلوع اسلام نے جون ۱۹۵۱ء میں اس موضوع پر ایک تفصیلی مقالہ لکھا جس میں یہ بتایا کہ یہ قانون کس طرح عقل اور قرآن دونوں کے خلاف ہے۔ اس کے بعد جون ۱۹۵۲ء میں پھر ایک مفصل مضمون شائع کیا جس میں ان اعتراضات کا جواب دیا گیا جو طلوع اسلام کے مضمون کے خلاف اٹھائے گئے تھے۔ ان معترضین میں سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی پیش پیش تھے۔ انھوں نے اس کے خلاف دلیل یہ پیش کی تھی:

> فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مرگیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اسکے چچا ہوتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں کے سوا کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلہ کی بناء قرار دیا جا سکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں، اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ (تین اہم عنوان ص۱۴۶)

اس کے بعد طلوع اسلام نے جب پھر قرآنی آیات سے یہ ثابت کیا کہ یتیم پوتے کو محروم الارث قرار دینا قرآن کی رو سے غلط ہے تو اس کے جواب میں مودودی صاحب نے لکھا کہ یہ ایک متفق علیہ مسئلہ ہے اور جو لوگ اس سے اختلاف کی جرأت کر رہے ہیں

> وہ قریب قریب سب کے سب کچھ ایسے ٹیڑھے ذہن کے لوگ ہیں جو ہر دینی مسئلہ میں ہمیشہ ایک نرالی اپج کی بات نکالا کرتے ہیں۔ ان کی بات اگر مانی جائے تو ہمیں گویا یہ ماننا پڑیگا کہ اس ایک مسئلہ میں نہیں بلکہ پورے دین کے سمجھنے میں پہلی صدی سے لیکر آج تک ساری امت غلطی کرتی رہی ہے اور دین کو اگر سمجھا ہے تو صرف اس دور کے تین چار آدمیوں نے سمجھا ہے۔ اس طرح کے خبطیوں کی بات آخر کس التفات کی مستحق ہو سکتی ہے۔ (ایضاً ص۲۱)

یعنی جواب میں نہ کوئی قرآن کی آیت پیش کی گئی، نہ ان قرآنی دلائل کا کوئی جواب دیا گیا جو اختلاف کرنے والوں کی طرف سے پیش کئے گئے تھے۔ کہا گیا تو اتنا کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے وہی صحیح ہے اس کے خلاف قرآنی آیات پیش کرنے والے مخبوط الحواس ہیں {ہم[1] نے ان تمام مباحث کو ایک کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے جس کا نام ہے "تین اہم مسائل" اس میں "قتل مرتد" "اسلام میں غلامی" اور "یتیم پوتے کی وراثت" کے متعلق قرآنی احکام درج ہیں۔}

اخبارات میں پنجاب اسمبلی کی جو روئیداد شائع ہوئی ہے اس میں لکھا ہے کہ چیمہ صاحب کے مسودۂ قانون کی مخالفت منجملہ دیگر حضرات کے مولانا داؤد غزنوی صاحب نے بھی کی۔ انھوں نے اس کی مخالفت میں کہا کہ

> اس مسئلہ پر حنفی، شافعی، اور یہاں تک کہ اہل شیعہ بھی متفق[2] ہیں اسلئے اس میں مداخلت کرنے کی جسارت نہیں کی جا سکتی۔ اسواسطے یا تو اس کو مسترد کر دیا جائے یا پھر علماء کی رائے حاصل کرنے کیلئے اسے مشتہر کر دیا جائے۔

یعنی مولانا داؤد غزنوی صاحب نے بھی وہی کچھ کہا ہے جو اس سے پہلے مودودی صاحب کہہ چکے ہیں۔ انھوں نے بھی یہ نہیں کہا کہ مروّجہ قانون کس طرح

---

[1] یہ کتاب دفتر طلوع اسلام سے مل سکتی ہے ضخامت ۲۱۲ صفحات قیمت دو روپیہ آٹھ آنے ۔ [2] مودودی صاحب نے لکھا تھا کہ شیعہ حضرات اس باب میں متفق نہیں ہیں۔

قرآن کے مطابق اور مجوزہ بل کس طرح اس کے خلاف ہے۔ انھوں نے دلیل یہ پیش کی ہے کہ مروّجہ قانون اسلئے صحیح ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقے اسے صحیح سمجھتے ہیں اور مجوزہ بل مسلمانوں کی اس روش کے خلاف ہے۔ (حالانکہ قرآن خود فرقوں کے وجود ہی کو شرک قرار دیتا ہے۔) یہ بعینہٖ وہی دلیل ہے جسے قرآن نے تمام انبیائے کرام کے تذکار جلیلہ کے سلسلہ میں بار بار دہرایا ہے یعنی جب وہ ان سے کہتے کہ تم خدا کی وحی کا اتباع کرو تو وہ جواب میں کہتے حسبنا ما وجدنا علیہ اٰباءنا کہ نہیں ہم خدا کی وحی پر چلنا نہیں چاہتے۔ جس مسلک پر ہمارے اسلاف چلے آرہے ہیں ہمارے لئے وہ مسلک بالکل کافی ہے۔ قرآن نے اس مسلک کی بار بار تردید کی ہے اور کہا ہے کہ کسی بات کے صحیح ہونے کی یہ کوئی دلیل نہیں کہ وہ اسلاف سے چلا آرہا ہے (ہر قسم اس پر متفق ہے۔ دلیل اور سند خدا کا قانون ہے اگر وہ بات خدا کے قانون کے مطابق ہے تو صحیح ہے اور اگر اس کے خلاف ہے تو وہ غلط ہے (یہ چیز ہی دلچسپی سے خالی نہیں کہ مولانا داؤد غزنوی صاحب حنفی اور شافعی فقہ کو دلیل میں پیش کر رہے ہیں اور خود اہل حدیث ہیں جو فقہ کے مسلک ہی کو غیر اسلامی قرار دیتے ہیں)۔

کوئی اور صاحب ہیں ابو القاسم دلداری، انھوں نے سترہ دسمبر کے "آفاق" میں اس بل کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مروجہ قانون وہ ہے کہ

> خلافت راشدہ میں اسی پر عمل تھا۔ ائمہ اربعہ نے بھی اسی پر اتفاق کیا۔ تیرہ صدیوں سے تمام ممالک اسلامیہ میں اسی پر عمل درآمد ہو رہا ہے کسی خلیفہ، کسی مجتہد، کسی امام، کسی مجدد، کسی محدث، کسی فقیہ، کسی سلطان نے اس اجماعی مسئلہ کو کبھی مسترد نہیں کیا۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس اتفاق میں ساری امت گمراہی پر گامزن رہی اور آجتک گمراہی پر چلی آتی ہے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تھا کہ ان اللہ لا یجمع امتی علیٰ ضلالۃ اور ید اللہ علی الجماعۃ (ترمذی) ترجمہ: حق تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کریگا۔ اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ یعنی جس بات پر امت متفق ہوتی ہے وہ حق ہی ہوتی ہے۔

طلوع اسلام میں اس سوال پر بارہا بحث ہو چکی ہے کہ اتفاق امت کس کو کہتے ہیں اور وہ کس طرح سے حاصل ہوتا ہے اور اس کے فیصلے کس طرح صحیح قرار پاتے ہیں۔ اسلئے اس بحث کو از سر نو چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہم صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر اس سے پہلے امت کو یہ حق حاصل تھا کہ اگر وہ کسی مسئلہ کے متعلق غور و فکر کے بعد کسی مسلک کو اختیار کرلے تو وہ مسلک صحیح قرار پاجاتا تھا تو اس امت کو آج اس حق سے کیوں محروم کیا جا رہا ہے کہ وہ کسی معاملہ پر غور و خوض کرکے باہم اتفاق سے کوئی فیصلہ کرلے۔ اگر پہلے اس قسم کا فیصلہ حق قرار پاتا تھا تو آج اسی قسم کا فیصلہ کیوں باطل قرار پائیگا۔ اب یہ کیوں فرض کرلیا گیا ہے کہ امت میں نہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی رہی ہے نہ کسی معاملہ میں فیصلہ کرنے کی استعداد۔ جو سوچا جانا تھا وہ سوچا جا چکا، جو فیصلے ہونے تھے وہ ہو گئے۔ اب آنیوالی امت قیامت تک انہی فیصلوں کی پابند چلی جائیگی۔

علاوہ بریں یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ اگر آنیوالی امت نے پہلے فیصلوں پر آنکھ بند کرکے چلے جانا تھا تو قرآن کو قیامت تک محفوظ رکھنے سے کیا فائدہ تھا۔؟ ذرا سوچئے کہ اگر آج ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ ہم قرآن کی روشنی میں خود کوئی فیصلہ کرسکیں یا جو فیصلے اس سے پہلے ہو چکے ہیں انھیں قرآن کی کسوٹی پر پرکھ سکیں تو قرآن کی موجودگی سے ہمیں کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کیا اب قرآن کا مصرف اتنا ہی ہے کہ اسے مُردے کو سُنایا جائے تاکہ اسکی موت آسانی سے واقع ہو جائے اور مرنے کے بعد قرآن پڑھ پڑھ کر اس کا ثواب مردوں کو بخشا جائے۔ اگر قرآن کا یہی مصرف باقی رہ گیا ہے تو پھر آپ یہ کہہ کر دنیا کو کیوں دھوکہ دیتے ہیں کہ مملکت پاکستان کا کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ آپ یہ اقرار کرتے ہیں کہ (جیسا کہ

مودودی صاحب نے اعتراف کیا ہے) آپ کو قرآن وسنت میں کوئی صریح سند نہیں ملتی جو مروجہ قانون وراثت کی تائید کرتی ہو۔ اس کے برعکس کہنے والے آپ سے یہ کہتے ہیں کہ یہ قانون اس طرح قرآن کے خلاف ہے۔ لیکن آپ کا اصرار ہے کہ ہم اسی قانون کو جاری رکھیں گے خواہ یہ قرآن کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

اگرچہ وراثت کا قانون ایک فنی مسئلہ ہے جو فنی طریق پر ہی سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے (اور یہ چیز ہمارے ان مضامین میں آچکی ہے جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے) لیکن بایں ہمہ قرآن کی رو سے مختصر الفاظ میں مسئلہ زیر نظر کی بابت کچھ بیان کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ قرآنی احکام وراثت میں ہے کہ

(۱) لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ..... نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (۴/۷)

(۲) يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ..... (۴/۱۱)

یعنی "اولاد" اپنے "والدین" کے ترکہ سے حصہ پاتی ہے۔ ہمارے ہاں "اولاد" کے معنی صرف بیٹا بیٹی کے جاتے ہیں اور "والدین" کے معنی صرف ماں باپ لیکن عربی زبان میں ان الفاظ کے معنی وسیع ہیں۔ ولد میں بیٹا اور بیٹے کی اولاد در اولاد (پوتا پر پوتا وغیرہ) سب شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح والدین میں باپ اور باپ کے والد در والد (دادا پر دادا وغیرہ) سب شامل ہوتے ہیں۔ "اولاد" کے یہ معنی لغت کے علاوہ ائمہ تفسیر حدیث اور فقہ سب کے ہاں مسلم ہیں۔ چنانچہ تفسیر خازن میں ہے کہ

"ولد" کا لفظ مذکر و مونث دونوں کے لئے بولا جاتا ہے اور اس میں اولاد در بیٹے کی اولاد در بیٹی کی اولاد میں کوئی فرق نہیں۔

اسی طرح فتح الباری شرح صحیح بخاری (پ ۲۴) میں ہے:

"ولد" کا لفظ مذکر و مونث دونوں سے عام ہے اور صلبی اولاد اور نیچے تک اولاد کی اولاد تک بولا جاتا ہے۔

فقہ وراثت کی مستند کتاب سراجی کی شرح شریفیہ (ص ۲۶) میں لکھا ہے کہ

اولاد میں بیٹے کی اولاد بھی شامل ہے کیونکہ ہم کو حق تعالیٰ نے بنی آدم کہا ہے۔

اسی طرح علامہ ابوبکر ابن العربی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھا ہے کہ چونکہ

ولد کا لفظ ولادت سے مشتق ہے اسلئے اولاد کی اولاد بھی حقیقۃً اولاد ہے جس طرح جزو کا جزو بھی یقیناً جزو ہوتا ہے۔

اس سے یہ بات صاف ہو گئی کہ "والد" کے معنی صرف باپ نہیں بلکہ باپ کے والد در والد اوپر تک سب اس میں شامل ہیں اور اسی طرح "وَلَدٌ" کے معنی صرف بیٹا نہیں بلکہ بیٹے کی اولاد در اولاد نیچے تک سب اس میں شامل ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر زید کا ایک بیٹا ہو اور ایک پوتا تو زید کی وفات پر اس کی جائداد صرف بیٹے کو ملے گی یا بیٹے اور پوتے دونوں کو (کیونکہ "ولد" میں بیٹا اور پوتا دونوں شامل ہیں) اس سوال کے حل کے لئے دوسرا اصول سامنے آتا ہے۔ قرآن نے "اقربون" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اقرب کے معنی ہیں وہ میت جس کے اور وارث کے درمیان کوئی اور موجود نہ ہو۔ زید کی وفات کے وقت اس کے اور اس کے بیٹے کے درمیان کوئی اور موجود نہیں اس لئے وہ اس کا اقرب ہے اسلئے وہ اس کی جائداد کا حصہ پائے گا۔ لیکن چونکہ

پوتے اور دادا کے درمیان لڑکے کا باپ موجود ہے اسلئے دادا اس پوتے کا اقرب نہیں ہو سکتا۔ لہذا بیٹے کی موجودگی میں پوتا وارث نہیں ہوگا لیکن اگر دادا کی زندگی میں اس کا بیٹا فوت ہو جائے تو دادا اور پوتے کے درمیان کوئی واسطہ نہیں رہتا اسلئے متوفی دادا اس پوتے کا اقرب ہو جاتا ہے اس بنا پر یتیم پوتا اپنے دادا کے ترکہ سے حصہ پائے گا۔ یہ بات ذیل کے نقشہ سے زیادہ واضح ہو جائے گی۔

زید (دادا)

(زید کی وفات کے وقت زندہ ہے) بکر — عمرو (زید کی زندگی میں فوت ہو چکا)

حامد — محمود

زید کی وفات کے وقت چونکہ بکر موجود ہے اس لئے اس کا بیٹا حامد اپنے دادا کی وراثت سے حصہ نہیں پائے گا۔ یہ حصہ اس کے باپ بکر کو ملے گا۔ لیکن دوسری طرف چونکہ عمرو زید کی زندگی میں فوت ہو چکا ہے اس لئے زید کی وفات کے وقت زید اور محمود کے درمیان کوئی موجود نہیں ہے اس لئے زید محمود کا اقرب ہو گیا۔ اس لئے زید کے ترکہ میں ایک طرف اس کے بیٹے بکر کا حصہ ہوگا اور دوسری طرف اس کے یتیم پوتے محمود کا حصہ ہوگا۔ یہ ہے قرآن کا قانون۔ لیکن ہمارا مروجہ قانون یہ کہتا ہے کہ نہیں اس صورت میں ساری جائیداد بکر کو ملے گی اور محمود (یعنی یتیم پوتا) اپنے دادا کے ترکہ سے ایک پائی بھی نہیں پا سکے گا۔ آپ یہ سن کر متعجب ہوں گے کہ اگر زید کی موجودگی میں محمود وفات پا جائے تو ہمارے فقہاء اس کی جائداد سے زید کو حصہ دلوا دیتے ہیں یعنی یتیم پوتے کی وراثت سے دادا تو حصہ پا سکتا ہے لیکن دادا کی وراثت سے یتیم پوتا حصہ نہیں پا سکتا۔ یہ ہے ہمارا وہ قانون جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ یہ صدیوں سے چلا آرہا ہے اس لئے اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ ہم ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ جب آپ سے خدا پوچھے کہ کیا میرے قرآن کا ایسا کھلا ہوا فیصلہ تمہارے سامنے نہیں تھا؟ تو آپ وہاں کیا جواب دیں گے؟

لیکن اس وقت ہم ان مخالفین سے کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ ہم ان حضرات کو مخاطب کرتے ہیں جن کا یہ ایمان ہے کہ ہمارے قوانین قرآن کے مطابق ہونے چاہئیں۔ یہ حضرات ہم سے اکثر پوچھا کرتے ہیں کہ ہمیں بتلائیے کہ ہم کیا کریں جس سے قرآنی قوانین نافذ ہو جائیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان حضرات کیلئے اللہ نے ایک موقعہ بہم پہنچایا ہے تاکہ وہ دیکھیے کہ یہ لوگ اپنے قرآنی ہونے کے دعوے کے ثبوت میں کیا کچھ کر کے دکھاتے ہیں۔ یہ مسودہ رائے عامہ کے استصواب کی غرض سے مشتہر کیا گیا ہے۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ عوام کو اس مسئلہ سے آگاہ کیا جائے اور لوگوں کی آراء کو حکومت تک پہنچایا جائے۔ اس کے لئے حسب ذیل عملی اقدام ضروری ہے۔

(۱) سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ عوام کو بتایا جائے کہ قرآن کی رو سے اصل صورت کیا ہے۔ اس کیلئے اگرچہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب (تین اہم مسائل) کی عام اشاعت مفید ہوگی لیکن چونکہ اس کی قیمت زیادہ ہے اس لئے ہم نے فیصلہ یہ کیا ہے کہ اس میں یتیم پوتے کے متعلق جس قدر مضامین آتے ہیں انہیں ایک پمفلٹ میں شائع کر دیا جائے۔ یہ پمفلٹ قریب ۲۴ صفحات پر مشتمل ہوگا۔ اس کی قیمت علاوہ محصول ڈاک صرف چار آنے فی پمفلٹ رکھی گئی ہے۔

(۲) آپ کوشش کیجئے کہ یہ پمفلٹ آپ کے علاقہ میں زیادہ سے زیادہ تقسیم ہو جائیں۔ جسقدر پمفلٹوں کی ضرورت ہو انھیں ہم سے منگا لیجئے۔

لیکن ہم پچیس پمفلٹوں سے کم نہیں بھیجیں گے۔

(۳) ان پمفلٹوں کو پنجاب اسمبلی کے ممبروں تک ضرور پہنچائیے اور ان سے خود بھی ملئے۔

(۴) عوام کی آراء حاصل کر کے انھیں سکرٹیری پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی لاہور تک پہنچائیے۔ اور ہمیں بھی اطلاع دیجئے کہ آپ نے اس سلسلہ میں کیا کیا ہے۔

(۵) اخبارات سے کہئے کہ وہ اس پمفلٹ کو اپنے ہاں شائع کریں۔

اگر آپ کی اس کوشش سے یہ ایک قانون بھی قرآن کے مطابق تبدیل ہو گیا تو میزان خداوندی میں آپ کی اس کوشش کا بڑا وزن ہوگا۔

باہمی تعاون

ایک مسلم گز ہیڈ آفیسر ایک ایسی رفیقۂ حیات کی تلاش میں ہیں جو قرآنی سیرت کی حامل ہوں۔ ۲۵-۳۰ سال کی عمر، صحت مند اور تعلیم یافتہ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے ہاں اولاد ہونے کی امید نہ ہو۔ اسلئے کہ ان کی مرحومہ بیوی سے ایک بچہ ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کی نئی بیوی اس بچہ کی پرورش حقیقی والدہ کی طرح کر سکے۔ پٹھان خاتون کو ترجیح دیتے ہیں۔ خط و کتابت راز میں رکھنے کا وعدہ کرتے ہیں جن کا پتہ یہ ہے:-

سردار۔ معرفت پوسٹ بکس ۲۷ جی، پی، او۔ لاہور

دیکھئے۔ اپنا خریداری نمبر تلاش کیجئے

جنوری ۱۹۵۴ء کی اس اشاعت کے ساتھ آپ حضرات کا چندہ (جن کے نمبر خریداری درج ذیل ہیں) ختم ہو گیا ہے۔ لہٰذا آئندہ ماہ فروری ۱۹۵۴ء کا پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی بھیجا جائیگا۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ۲۰ جنوری ۱۹۵۴ء سے پہلے پہلے آپ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں کہ اس میں ادارہ کو سہولت اور آپ کو کفایت ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے خدانخواستہ آپ رسالہ کی خریداری آئندہ جاری رکھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو ۲۰ جنوری سے پہلے پہلے ادارہ کو اپنے اس فیصلہ سے مطلع فرمادیں ورنہ ادارہ کی طرف سے مرسلہ وی پی کو وصول فرمانا آپکا اخلاقی فریضہ ہوگا۔

فہرست خریداران جن کا چندہ ختم ہوگیا ہے

۱۹۶ - ۴۲۰ - ۴۲۹ - ۴۳۵ - ۴۴۴ - ۴۴۷ - ۴۵۱ - ۴۷۱ - ۴۸۷ - ۷۲۲ - ۷۲۵ - ۷۳۳ - ۷۳۴ - ۷۳۶ - ۷۳۷ - ۷۳۸ - ۷۴۱

۷۴۳ - ۷۴۴ - ۷۴۷ - ۵۵۲ - ۷۵۶ - ۷۵۹ - ۷۶۰ - ۷۶۳ - ۷۶۵ - ۷۶۶ - ۷۷۱ - ۷۷۲ - ۷۷۶ - ۸۱۱ - ۸۲۹ - ۸۴۷ - ۸۵۴ - ۷۸۸

۸۰۹ - ۹۰۹ - ۱۰۱۶ - ۱۱۹۶ - ۱۲۲۹ - ۱۲۳۱ - ۱۲۳۳ - ۱۲۴۰ - ۱۲۴۱ - ۱۲۴۲ - ۱۲۶۷ - ۱۲۹۲ - ۱۲۹۵ - ۱۳۰۹ - ۱۳۱۱ - ۱۳۱۶ - ۱۳۱۷ -

۱۳۱۸ - ۱۳۱۹ - ۱۳۲۲ - ۱۳۲۴ - ۱۳۲۷ - ۱۳۲۸ - ۱۳۳۲ - ۱۳۳۳ - ۱۳۳۴ - ۱۳۳۶ - ۱۳۳۷ - ۱۳۳۸ - ۱۳۳۹ - ۱۳۴۱ - ۱۳۴۵

۱۳۴۶ - ۱۳۴۷ - ۱۳۵۲ - ۱۴۳۶ - ۱۴۳۹ - ۱۴۴۱ - ۱۴۴۳ - ۱۴۴۴ - ۱۴۴۵ - ۱۴۴۶ - ۱۴۴۷ - ۱۴۴۸ - ۱۴۴۹ - ۱۴۶۴ - ۱۵۱۳

۱۵۱۴ - ۱۵۱۵ - ۱۵۵۷ - ۱۶۴۹ -

سلیم کے نام

(لا اکراہ فی الدین)

ہاں سلیم! تم ٹھیک سمجھے ہو کہ دین میں کسی قسم کی زبردستی نہیں، لیکن یہ بات اتنی ہی نہیں جتنی تم سمجھے ہو۔ یہ اس سے کہیں زیادہ وسیع اور گہری ہے۔ تم نے زبردستی کا صرف ایک پہلو لیا ہے۔ یعنی کسی سے بزور شمشیر کچھ منوانا۔ جیسا فرعون نے اپنے دربار کے ساحرین سے کہا تھا کہ تم میری اجازت کے بغیر ہی (حضرت) موسیٰؑ کے خدا پر ایمان لائے ہو؟ تمہیں میرے غصہ کا بھی کوئی خیال نہیں آیا۔ دیکھو میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں؟ میں تمہیں ابھی سولی پر لٹکا دوں گا۔ یہ وہ زبردستی ہے جسے مستبد حکمرانوں کی فرعونیت بروئے کار لاتی ہے۔ لیکن قرآن اس سے کہیں آگے جاتا ہے اور زبردستی کے ایسے ایسے پہلو سامنے لاتا ہے جن کے تصور تک سے ذہن انسانی آشنا نہ تھا۔

تم سب سے پہلے یہ سمجھ لو کہ دین (قرآنی نظام زندگی) کا مقصود کیا ہے؟ اس کا مقصود ہے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کی نشوونما (DEVELOPMENT) ذات۔ انا۔ یا خودی کی بنیادی خصوصیات (BASIC ATTRIBUTES) ہیں یگانگت (UNIQUENESS) اور حریت (FREEDOM) جسے قرآن (انائے مطلق یعنی اللہ کے ضمن میں) احدیت اور صمدیت سے تعبیر کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ قل ھو اللہ احد۔ اللہ الصمد۔ یگانگت کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ ہر ذات اپنے عمل سے متاثر ہو۔ کسی دوسرے کا عمل نہ اسے فائدہ پہنچا سکے نہ نقصان۔ انسان کی جسمانی دنیا میں اس کی مثال اس طرح سمجھو کہ میری صحت پر میری غذا اور میری ورزش ہی کا اثر پڑ سکتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اچھی غذا کوئی اور کھائے اور خون صالح میرے اندر پیدا ہو۔ یا ورزش کوئی اور کرے اور صحت میری اچھی ہوتی جائے۔ اسی طرح انسانی ذات کا ضعف یا استحکام خود اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے (اسی کو قانون مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے)۔ اس حقیقت کو قرآن نے بار بار دہرایا ہے تاکہ انسان ان غلط فہمیوں کا شکار نہ ہونے پائے جن میں "مذہبی دنیا" (اس سے پیشتر) مبتلا ہو چکی تھی (اور جن میں اب خود مسلمان مبتلا ہے کیونکہ اس نے قرآن کو چھوڑ کر وہ مذہب اختیار کر رکھا ہے، جو دوسروں سے مانگے ہوئے تصورات و معتقدات پر مبنی ہے)۔ ظاہر ہے کہ انسان کی ذات صرف اسی عمل سے اثر پذیر ہو سکتی ہے جو اس کے اختیار و ارادہ (دل کی مرضی) سے سرزد ہو۔ یہاں سے انسانی جسم اور اس کی ذات کا فرق شروع ہو جاتا ہے۔ جسم انسانی، ایک مشین کی طرح ہر عمل سے متاثر ہو جاتا ہے، خواہ وہ کام ارادۃً کیا جائے یا بلا ارادہ۔ تم سنکھیا اپنی مرضی سے کھاؤ یا تمہیں زبردستی کھلا دیا جائے، دونوں صورتوں میں تمہارے جسم پر اس کا اثر یکساں ہوگا۔ لیکن انسانی ذات کی صورت اس سے مختلف ہے۔ وہ اُسی عمل سے متاثر ہوتی ہے جو ارادۃً کیا جائے۔ اسی کا نام حریت (FREEDOM) ہے یعنی آزادیٔ عمل۔ قرآن ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے جس میں ہر فرد کو زیادہ سے زیادہ حریت فکر اور آزادیٔ عمل حاصل ہو۔ جس میں کوئی فرد اپنی ضروریات زندگی کے لئے کسی دوسرے فرد کا محتاج نہ ہو اور ہر فرد اپنے اختیار و ارادہ سے اپنی محنت کے ماحصل کو

نوعِ انسانی کی نشوونما کے لئے کھلا چھوڑ دے۔

اس تمہید سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہوگی کہ

(۱) دین سے مقصود ہے ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل جس میں انسانی ذات کی زیادہ سے زیادہ نشوونما ہو جائے۔

(۲) انسانی ذات کی نشوونما ان اعمال سے ہوتی ہے جو انسان سے ارادۃً سرزد ہوں۔

لہٰذا دین اور زبردستی دو متضاد چیزیں ہیں۔ "زبردستی" سے وہ مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے جو دین کا منتہیٰ ہے۔

میں نے تمہیں ایک خط میں بتایا تھا[1] کہ انسان کی کوئی "فطرت" نہیں۔ "فطرتِ انسانی (HUMAN NATURE) کا تصور ہی غیر قرآنی ہے۔ "فطرت" ان اشیائے کائنات کو دی گئی ہے جنہیں ایک خاص قانون کے مطابق مصروفِ عمل رہنے کے لئے مجبور پیدا کیا گیا ہو۔ پانی کی یہ فطرت ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ آگ کی فطرت ہے کہ وہ حرارت پہنچاتی ہے۔ اس تمام کائنات میں صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جسے اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔ اختیار و ارادہ خدا کی صفت ہے جس کا ایک شمہ انسان کو عطا کر دیا گیا ہے۔ یہی وہ روحِ خداوندی ہے جسے انسان کے اندر پھونکا گیا ہے۔ اسی سے انسانی ذات کا سراغ ملتا ہے۔ خدا کی ذات، ذاتِ مطلق ہے اس لئے اس کا اختیار و ارادہ بھی بلا حدود و قیود ہے۔ (یعنی کوئی اور طاقت ایسی نہیں جو اس کے ارادے پر حدود و قیود عائد کر سکے)۔ انسانی ذات کا پیمانہ چھوٹا ہے اس لئے اس کے اختیار و ارادہ کا میدان بھی لامحدود نہیں۔ جوں جوں انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اس کے اختیار و ارادہ کی وسعتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہی وہ "سلطان" (یعنی قوت) ہے جس سے یہ "اقطار السمٰوٰت والارض" سے آگے جا سکتا ہے[2] اور حیاتِ جاوداں حاصل کر سکتا ہے۔ کائنات میں اور کسی شے کے سامنے کھلی ہوئی ممکنات (OPEN POSSIBILITIES) نہیں ہیں کہ وہ ان میں سے جسے چاہے اختیار کر لے اور جسے چاہے چھوڑ دے۔ یہ ممکنات صرف انسان کے سامنے رکھی گئی ہیں۔ مشیت (یعنی اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنا) یا خدا کو حاصل ہے اور یا (خدا کی عطا کردہ قوت کی بنا پر) انسان کو۔ اعملوا ما شئتم (۴۱/۴۰) صرف انسان سے کہا گیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

(۱) جب انسان کو اختیار و ارادہ دے دیا گیا ہے کہ وہ جونسی راہ چاہے اپنے لئے اختیار کرلے۔

(۲) ایک راستہ اسے تباہی کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا راستہ خوشگواریوں کی طرف۔ اور

(۳) ان راستوں کی پہچان اس کی فطرت کے اندر داخل نہیں کیونکہ انسان کی کوئی فطرت ہی نہیں۔

تو پھر وہ کونسی صورت ہے جس سے انسان صحیح راستے پر چلے اور غلط راستے کی تباہ کاریوں سے بچ جائے۔ اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ انسان کو اس کے تجربوں پر چھوڑ دیا جاتا۔ وہ ہر راستہ پر چل کر تجربہ کرتا اور غلط راستے کی تباہیوں اور بربادیوں کے بعد از خود اس نتیجہ پر پہنچتا کہ وہ

---

[1] یہ خط "سلیم کے نام" خطوط کے مجموعہ میں شائع ہو چکا ہے۔

[2] یٰمعشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السمٰوٰت والارض فانفذوا۔ لا تنفذون الا بسلطٰن (۵۵/۳۳)

غلط راستے پر چل رہا ہے۔ اس صورت میں جسقدر وقت صرف ہوتا اور انسانی توانائیاں ضائع ہوتیں اس پر کاروانِ انسانیت کی تاریخ اور دورِ حاضرہ کے عالمگیر حوادث شاہد ہیں۔ دوسری صورت یہ تھی کہ اسے ایسا ضابطۂ ہدایت دیدیا جاتا جو زندگی کے ہر دوراہے پر بتا سکتا کہ صحیح راستہ کونسا ہے اور غلط کونسا اور اس طرح اس کیلئے تباہیوں اور بربادیوں سے بچنے کا امکان پیدا کر دیا جاتا۔ یہ دوسری شکل تھی جو اس کیلئے اختیار کی گئی۔ اس ضابطۂ ہدایت کا نام قرآن ہے جو اسے وحی کے ذریعے دیا گیا۔

اب ظاہر ہے کہ اگر اس ضابطۂ ہدایت کو زبردستی منوایا جائے تو وہ مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے جس کے لئے یہ طریقِ کار اختیار کیا گیا ہے۔ اگر زبردستی ہی منوانا تھا تو اس کا آسان (اور کامیاب) طریقہ یہ تھا کہ انسان کو بھی (دیگر اشیائے کائنات کی طرح) مجبور پیدا کر دیا جاتا اور تمام انسان قانونِ فطرت کے ماتحت آنکھیں بند کئے ایک ہی روش پر چلتے جاتے۔ قرآن نے جب کہا ہے کہ ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ (۱۶/۹۳) تو اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی فلاح و بہبود کی صورت یہی ہے کہ وہ ایک امۃ واحدۃ بن کر زندگی بسر کرے لیکن اس روش کو اسے اپنے دل کی مرضی سے اختیار کرنا چاہئے۔ ہم اس کے ارادے کو سلب کر کے اسے امۃ واحدۃ نہیں بنانا چاہتے۔ اس طرح تو وہ ایسی ہی امۃ واحدہ بن جائے گا جیسے دنیا کے پتھر ایک ہی نوع ہیں اور ہر مقام پر پانی کی ایک ہی خاصیت ہے۔ اس صورت میں انسان میں اور دیگر اشیائے کائنات میں فرق کیا رہا؟ اگر یہی صورت ہوتی تو آدم مسجود ملائکہ (یعنی ایسی ہستی جس کے سامنے کائناتی قوتیں سرِ تسلیم خم کر دیں) کس طرح بن جاتا! لہٰذا ہم نے کیا یہ ہے کہ اس کے سامنے دونوں راستے کھلے کھلے طور پر رکھ دیئے ہیں اور اس کے بعد اسے اختیار دیدیا ہے کہ ان میں سے جس راستے کو چاہے اختیار کر لے۔ فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر (۱۸/۲۹)

اب آگے بڑھو۔ زبردستی کا ایک پہلو تو وہ ہے جس کا ذکر خود تم نے کیا ہے۔ یعنی کسی سے "ڈنڈے کے زور" پر کچھ منوا لینا۔ لیکن اس کا ایک پہلو اور بھی ہے اور یہ پہلو، اس اول الذکر پہلو سے کہیں زیادہ لطیف اور عمیق ہے۔ تم نے اچھے اچھے سمجھدار لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ جب وہ کسی پیر کے مرید ہو جاتے ہیں تو پھر ایسی ایسی لایعنی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں، جن پر اس سے چند روز پہلے وہ خود ہنسا کرتے تھے۔ اس کے بعد تم نے دیکھا ہوگا کہ وہ پیر صاحب کے کہنے پر اس قسم کے کام کرنے لگ جاتے ہیں جن میں ان کا صریحاً نقصان ہوتا ہے لیکن وہ کسی کی نہیں سنتے۔ آپ لاکھ سمجھائیے، وہ ایک نہیں مانتے۔ دانشمندی کی کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیر صاحب نے انھیں کوئی نشہ پلا رکھا ہے جس سے ان کی عقل و خرد سب مفلوج ہو چکی ہے اور اب یہ اپنے اختیار و ارادے سے کچھ نہیں کرتے جس قسم کا وہاں سے اشارہ پاتے ہیں، بلا چون وچرا، ایک مشین کی طرح اس کی تعمیل کرتے چلے جاتے ہیں۔

تم نے کبھی سوچا بھی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے ہوتا ہے کہ پیر صاحب کی کسی "کرامات" کو دیکھکر، یا اس کے چرچے سن کر یا کسی اور طرح سے ان کی "روحانی طاقت" سے متاثر ہو کر انسان اس طرح خائف (OVER-AWED) ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد اس کی قوتِ فیصلہ ماؤف ہو جاتی ہے اور اختیار و ارادہ باقی نہیں رہتا۔ اسے ذہنی اکراہ (MENTAL COMPULSION) کہتے ہیں۔ یہ ہے اکراہ (زبردستی) کی وہ شکل جسے میں نے جسمانی اکراہ سے کہیں زیادہ مہیب اور عمیق قرار دیا ہے۔

رسول اللہ تشریف لائے تو آپ نے قرآن کو ایک ضابطۂ حیات کے طور پر پیش کیا اور یہ کہا کہ جس طرح خدا کا قانون تمام کائنات میں جاری وساری ہے، اسی طرح اس کا یہ قانون انسانی معاشرہ میں جاری وساری ہونا چاہئے۔ قانون (LAW) ہمیشہ اپنے نتیجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ مثلاً یہ قانون ہے کہ گندم از گندم بروید، جو ز جو۔ اس کا ثبوت کیا ہے کہ گندم از گندم بروید۔ یعنی گندم بونے سے گندم ہی پیدا ہوتا ہے؟ اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم گندم بو کر دیکھو۔ جب اپنے وقت مقررہ پر فصل پک جائے گی تو تم دیکھو گے کہ اس سے گندم ہی پیدا ہوگی۔ یہی اس کا ثبوت ہے۔ اسے (PRAGMATIC TEST) کہتے ہیں۔ یعنی قانون کے دعوے کو اس کے نتیجے سے پرکھنا۔ رسول اللہ قرآن کو اسی حیثیت سے پیش کرتے لیکن وہ لوگ (جن کا ذہن توہم پرستی کا خوگر تھا) آپ سے کہتے کہ ہمیں کوئی معجزہ دکھاؤ، تو ہم جب مانیں گے۔

سلیم! ذرا قرآن کھول کر دیکھو۔ مخاطبینِ قریش کی طرف سے کس طرح بار بار اس مطالبہ کو دہرایا گیا ہے۔ لیکن اس کا جواب خدا کی طرف سے کیا دیا گیا؟ مثلاً سورۂ رعد میں ہے ویقول الذین کفروا لولا انزل علیہ آیۃ من ربہ۔ یہ انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ اس رسول کو اس کے خدا کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نہیں دیا جاتا؟ اس کے جواب میں قرآن نے دو باتیں کہی ہیں، ایک تو یہ کہ ان لوگوں سے کہو کہ ذرا سوچو کہ میری دعوت کیا ہے اور تمہارا مطالبہ کیا ہے؟ میں تمہارے سامنے کیا پیش کرتا ہوں اور تم اس کے ثبوت میں مجھ سے کیا چاہتے ہو! میں تمہارے سامنے ایک قانون پیش کرتا ہوں، اور وہ قانون یہ ہے کہ تم جس غلط روش پر چل رہے ہو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہے۔ (انما انت منذرٌ) اس کے جواب میں تم مجھ سے کہتے ہو کہ ہم اس بات کو جب مانیں گے اگر تو اس پتھر کو پانی پر تیرا دے! ذرا غور کرو کہ میرے دعوے اور تمہارے اس مطالبہ میں کوئی ربط بھی ہے؟ اگر فرض کرو کہ یہ پتھر پانی پر تیرنے بھی لگ جائے تو اس سے یہ کس طرح ثابت ہو جائے گا کہ تمہاری روش کا نتیجہ تباہی ہے؟ تم مجھ سے میرے دعوے کے علمی دلائل طلب کرو۔ تم اس کے لئے تاریخی شہادتوں کا مطالبہ کرو۔ میں پیش کروں گا۔ اور اگر تم اس طرح نہیں سمجھنا چاہتے تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ تم انتظار کرو تاوقتیکہ تمہارے اعمال کے نتائج برآمد ہونے کا وقت آجائے۔ اس وقت تم خود دیکھ لوگے کہ میں جو کچھ کہتا تھا وہ سچ تھا یا نہیں!

تم نے غور کیا سلیم! کہ یہ جواب کس طرح علم ودانش اور بصیرت وبرہان پر مبنی ہے!

اس کے ساتھ ہی ایک اور بات بھی کہی۔ اس پر بھی غور کرو۔ ان سے کہا گیا کہ اگر یہ معاملہ میرے اور تمہارے درمیان ہی ہوتا تو بھی یہ ہو سکتا تھا کہ میں تمہیں کوئی اعجوبہ دکھا کر قائل کر لیتا۔ لیکن یہاں تو صورت ہی مختلف ہے۔ یہ قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے قیامت تک کیلئے ضابطۂ حیات ہے۔ اس لئے اس کے دعاوی کے ثبوت میں دلائل بھی ایسے ہونے چاہئیں جو تمام دنیا کے لئے، ہر زمانہ میں، حتمی اور یقینی دلائل تسلیم کئے جائیں۔ اگر بفرضِ محال میں نے تمہیں کوئی معجزہ دکھا کر اس قرآن کی صداقت کا قائل کرا بھی لیا تو یہ دلیل بعد میں آنے والے انسانوں کے لئے کیا فائدہ دیگی؟ میرے دعوے کی بنیاد علم وبصیرت پر ہے اس لئے میں اسے دلائل وبراہین یا اس نظام کے عملی محسوس نتائج ہی سے منوانا چاہتا ہوں۔

آیت کے دونوں ٹکڑے یوں ہیں۔ انما انت منذرٌ ولکلِ قوم ھاد (۱۳/۷) ان سے کہدو کہ میں تو تمہاری غلط روش کے تباہ کن

نتائج سے آگاہ کرتا ہوں اور میں صرف تمہاری طرف ہی مبعوث ہو کر نہیں آیا بلکہ میری رسالت تمام اقوامِ عالم کے لئے ہے۔

چونکہ جماعتِ مومنین کی دلی خواہش تھی کہ خدا کا نظام ربوبیت کسی نہ کسی طرح جلدی سے متشکل ہو جائے اسلئے ان کی بیتابی تمنا بعض اوقات ان کے دل میں بھی اس قسم کا خیال پیدا کر دیتی تھی کہ اگر مخالفین کا یہ گروہ اتنی سی بات پر راضی ہو جاتا ہے تو انھیں کوئی معجزہ دکھا دینا چاہئے۔ اس سے اتنا بڑا امر جلد طے ہو جائے گا۔ یہ سب کے سب نظامِ خداوندی میں شامل ہو جائیں گے۔ تمام مصیبتیں کٹ جائیں گے زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ ان کی یہ آرزو قابلِ فہم ہے۔ لیکن اس کے جواب میں ان سے کہا جاتا کہ تمہاری یہ آرزو ہزار مقدس سہی، لیکن تمہارا خیال صحیح نہیں۔ اس طرح سے نظامِ خداوندی قائم نہیں ہوا کرتا۔ اس کے لئے تو دل کی رضامندی بنیادی شرط ہے۔ ولوان قرآنا سیرت به الجبال او قطعت به الارض او کلم به الموتی (۱۳/۳۱) اگر کوئی قرآن ایسا بھی ہوتا جس سے پہاڑ چلنے لگ جاتے۔ یا اس سے زمین کی لمبی لمبی مسافتیں لمحوں میں طے ہو جایا کرتیں۔ حتی کہ اس سے مردے بھی بولنے لگ جاتے۔ تو بھی اس سے اس قسم کا ایمان پیدا نہ ہو سکتا جس کی نظامِ خداوندی کی تشکیل کے لئے ضرورت ہے۔ یہ تمام باتیں خدا کے اختیار میں ہیں۔ وہ یہ سب کچھ کر سکتا ہے (بل اللہ الامر جمیعا) لیکن وہ کسی کو زبردستی مومن نہیں بنانا چاہتا۔ اگر زبردستی مومن بنانا ہوتا تو خدا کے لئے یہ کیا مشکل تھا کہ وہ سب انسانوں کو پیدا ہی ایسا کرتا کہ وہ مجبوراً ایک راہ پر چلتے! چونکہ خدا نے ایسا نہیں کیا اسلئے جماعتِ مومنین کو سمجھ لینا چاہئے کہ معجزات دکھا کر زبردستی مومن بنانا بھی خدائی مشیت کے خلاف ہے۔ اسلئے کہ اس سے انسان کا اختیار و ارادہ سلب ہو جاتا ہے۔

سورۂ یونس میں خود نبی اکرمؐ سے خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ ولو شاء ربک لآمن من فی الارض کلھم جمیعا۔ اگر خدا چاہتا تو اس کے لئے یہ کیا مشکل تھا کہ وہ تمام روئے زمین کے رہنے والوں کو مومن بنا دیتا۔ لیکن اس طرح زبردستی مومن بنانا خدا کے پروگرام میں ہی نہیں۔ اسلئے افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین (۱۰/۹۹) کیا تو لوگوں کو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ضرور ایمان لے آئیں! ایمان وہی ایمان ہے جو ہمارے قانون کے مطابق لایا جائے۔ (وما کان لنفس ان تؤمن الا باذن اللہ) اور ہمارا قانون اس باب میں یہ ہے کہ جو لوگ عقل و خرد سے کام نہیں لیتے ان کے سامنے معاملہ کبھی واضح ہو کر نہیں آتا۔ ان کی نگاہوں میں حق اور باطل اس طرح مخلوط رہتا ہے جس طرح کنوئیں کی تہ میں مرجاس[1] پھیرنے سے سارا کیچڑ پانی میں مل جاتا ہے اور اس طرح صاف اور شفاف پانی گدلا ہو جاتا ہے۔ (ویجعل الرجس علی الذین لا یعقلون۔ ۱۰/۱۰۰) لہٰذا ایمان وہی ہے جو عقل و خرد اور علم و بصیرت کی بنا پر لایا جائے نہ وہ جو کسی کے دماغ کو باؤف کر کے زبردستی منوا لیا جائے۔[2]

---

[1] مرجاس۔ رسّے کے ساتھ پتھر یا لوہے کے کانٹے باندھ کر اس سے کنوئیں کی تہ کو ہلایا جاتا تھا تاکہ کیچڑ اوپر آجائے اور پھر اسے صاف کر لیا جائے اسے مرجاس کہتے تھے۔ رجس کے معنی سخت کثافت اور گدلاپن ہے۔

[2] جن معجزات کا قرآن میں ذکر ہے وہ نزولِ قرآن کے زمانے سے پیشتر کے ہیں۔ رسول اللہؐ کو صرف قرآن ہی بطور معجزہ دیا گیا تھا۔ اس کی تفصیل کے لئے معراجِ انسانیت (باب معجزات) دیکھنا چاہئے۔

اب اس سے آگے بڑھو سلیم! اور ذہنی اکراہ کی ایسی شکل کو دیکھو جس تک قرآن کی آنکھ ہی پہنچ سکتی تھی۔ یہ حقیقت تمہارے سامنے آچکی ہے کہ قرآن کی پوری تعلیم مکافاتِ عمل کے محور کے گرد گھومتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ اس کی نگاہ کی خیانت اور دل کی جنبش بھی اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہتی ہے۔ اسی کا نام قانونِ مکافاتِ عمل ہے اور اسی پر دین کی ساری عمارت قائم ہے۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتاتا ہے کہ ہر عمل اور اس کے نتیجہ کے ظہور میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ جو بیج آج بویا جاتا ہے، اس میں مہینوں اور برسوں بعد جا کر پھل آتا ہے۔ اس "پھل آنے" کا عمل (PROCESS) تو بیج کے بونے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے لیکن یہ عمل اپنی تکمیل تک ایک مدت کے بعد جا کر پہنچتا ہے۔ یعنی یہ بیج رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ، نشوونما پاتا ہے اور اس طرح تدریجاً آگے بڑھتا ہوا اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا پھل مشہود طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اسے ظہورِ نتائج کا وقت کہتے ہیں۔ اور اس تدریجی ارتقاء کو قانونِ تدریج یا امہال (مہلت کا قانون) کہا جاتا ہے۔ یہ مہلت کا عرصہ مختلف اعمال میں مختلف ہوتا ہے (جس طرح مختلف فصلوں کے پکنے اور مختلف درختوں کے پھل لانے کا وقفہ مختلف ہوتا ہے)۔ مہلت کی یہ مدت (یعنی یہ عرصہ جس میں عمل اپنا نتیجہ مرتب کرتا ہے) خدا کے قانون کے مطابق متعین ہوتا ہے (لکل اجل کتاب۔ ہر میعاد کے لئے ایک قانون ہے)۔ بعض اوقات یہ عرصہ اسقدر لمبا ہوتا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی میں عمل کا نتیجہ سامنے نہیں آتا بلکہ اس کے بعد کی زندگی میں مرتب ہوتا ہے۔ اس مہلت میں بڑی مصلحتیں ہیں لیکن یہی چیز بڑے اضطراب اور فساد کا باعث بھی بن جاتی ہے (اور ہمیشہ بنتی رہی ہے) ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص صریحاً ظلم کر رہا ہے۔ دنیا اس کے ہاتھوں سے تنگ ہے۔ مظلوم اس انتظار میں رہتے ہیں کہ اس پر کوئی آفت ٹوٹے۔ لیکن وہ دندناتا ہوا پھرتا ہے اور ساری عمر عیش و عشرت میں گذار کر مر جاتا ہے۔ اس کا بال تک بھی بیکا نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر لوگ خدا کے قانونِ مکافات ہی میں شک کرنے لگ جاتے ہیں اور بعض اس سے انکار ہی کر دیتے ہیں۔ وہ کہہ دیتے ہیں کہ اگر خدا کا ہاتھ واقعی کہیں ہوتا تو وہ اس ظالم کی کلائی کیوں نہ مروڑ دیتا! ہم دیکھتے ہیں کہ مظلوم دن بدن پستے چلے جاتے ہیں اور ظالم اور سرکش انسان پنپتے چلے جاتے ہیں۔ کہاں ہے خدا کا عدل؟ وہ انھیں پکڑتا کیوں نہیں؟ وہ ان کا ٹینٹوا کیوں نہیں دباتا؟ یہ اسے اعلانیہ گالیاں دیتے ہیں۔ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور دن بدن پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں!

حقیقت یہ ہے کہ یہ چیزیں ایسی بدیہی ہیں کہ انکار کرنے والے تو ایک طرف، اقرار کرنے والوں کا بھی جی یہی چاہتا ہے کہ ان ظالمین پر جلدی گرفت ہو۔ "حرامزادے کی رسی" کبھی دراز نہ ہو۔ انھیں ان کے مظالم کی سزا فوراً مل جائے۔ ادھر کسی مظلوم کی طرف ان کا ہاتھ اٹھے اور ادھر سے خدا کا ہاتھ آگے بڑھ کر ان کی کلائی مروڑ دے۔ ان کی تباہی ہمارے سامنے آجائے۔ ہم اپنی آنکھوں سے ان کا انجام دیکھ لیں۔ یہ خیالات رہ رہ کر ہمارے دل میں اٹھتے ہیں۔

ان خیالات کی شدت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ایک داعی انقلاب (خدا کا رسول) ان مخالفین کو للکار کر کہتا ہے کہ تم جس روش پر چل رہے ہو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہے۔ تم ذلیل و خوار ہو گے۔ تم تباہ اور برباد ہو جاؤ گے۔ تم اپنی اس سرکشی کو چھوڑ دو ورنہ تمہارا انجام سخت عبرت انگیز ہو گا۔ ادھر سے تنذیر ہوتی ہے اور ادھر سے ان کی سرکشی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ اس داعی اور اس کے ساتھیوں کی جماعت کو اور زیادہ ستانا شروع کر دیتے ہیں اور ان سے بار بار کہتے ہیں کہ کہاں ہے وہ تباہی جس کی تم ہمیں اس طرح دھمکی دیتے تھے؟ کہاں ہے خدا کا وہ عذاب جس سے

تم ہمیں یوں ڈراتے تھے؟ وہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان سے استہزا کرتے ہیں۔ ان پر فقرے چست کرتے ہیں۔ ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتے ہیں اور ان سے پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اپنے خدا سے کہو کہ وہ ہم پر عذاب لے آئے؟ ویقولون متیٰ ھٰذا الوعد ان کنتم صٰدقین (۱۰/۴۸) یہ کہتے ہیں کہ اگر تم اپنی ان دھمکیوں میں سچے ہو تو بتاؤ کہ یہ عذاب کب واقع ہوگا! یہ تباہی کب آئے گی؟ اس کے جواب میں ان سے کہا جاتا ہے تو صرف یہ کہ "ان سے کہدو کہ یہ بات میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں تم پر اس عذاب کو جب جی چاہے لے آؤں۔ میں تو اپنی ذات کے لئے نفع اور نقصان تک کا بھی اختیار نہیں رکھتا۔ یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ میں تو اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ہر عمل کے لئے ظہور نتائج کی ایک میعاد مقرر ہے۔ جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر اس تباہی میں ایک ثانیہ کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی"۔ (قل لا املک لنفسی ضرا ولا نفعا الا ماشاء اللہ۔ لکل امۃ اجل۔ فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون ۱۰/۴۹)۔ لیکن اس جواب کا ان پر کیا اثر ہو سکتا ہے؟ وہ اسے اعترافِ شکست قرار دیتے ہیں اور اس طرح ان کی جرأتیں اور بے باک ہو جاتی ہیں۔ دوسری طرف خود ماننے والوں کا اضطراب بھی بڑھ جاتا ہے اور وہ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ متیٰ نصر اللہ۔ بالآخر خدا کے غلبہ و نصرت کا وقت کب آئے گا؟

تم نے غور کیا سلیم! کہ اس قانونِ مہلت کا اثر کیا ہوتا ہے؟ لیکن اس کے باوجود، خدا نہ تو ان مخالفین کے طعن و تشنیع سے غصے میں آتا ہے اور نہ ہی ان مظلومین کے وفورِ اضطراب سے متاثر ہوتا ہے (اسلئے کہ قانون وہی محکم ہوتا ہے جو جذبات سے اثر پذیر نہ ہو۔ لاتبدیل لکلمٰت اللہ۔ خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔ صرف خدا ہی کہہ سکتا ہے جو جذبات سے متاثر نہیں ہوتا) قانونِ مہلت اپنی اسی رفتار سے چلا جاتا ہے اور ظہورِ نتائج سے پہلے کبھی کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ یہ ظہور نتائج کبھی تو ان کی زندگی میں واقعہ ہو جاتے ہیں اور کبھی اس کے بعد۔ حتیٰ کہ اس باب میں (اور تو اور) خود رسالتمآب کے لئے بھی کوئی رعایت نہیں برتی جاتی اور آپ سے بھی کہدیا جاتا ہے کہ وان ما نرینک بعض الذی نعدھم او نتوفینک (۱۰/۴۶) ہم نے ان لوگوں سے کہا ہے کہ ان کے اعمال کس کس قسم کی تباہی لائیں گے تو ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض چیزیں تمہاری زندگی میں واقعہ ہو جائیں اور بعض باتیں تمہاری وفات کے بعد وقوع پذیر ہوں۔ لیکن تمہیں اس سے قطعاً متاثر نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ فانما علیک البلٰغ۔ تمہارے ذمہ صرف ان قوانین کا ان لوگوں تک پہنچا دینا ہے۔ وعلینا الحساب۔ یہ بات ہمارے لئے ہے کہ ان کے اعمال کا نتیجہ کیا ہوگا اور وہ کب برآمد ہوگا۔ اس کا فیصلہ ہمارا قانونِ مہلت کرے گا۔

اس مقام پر تمہارے دل میں لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس قانونِ مہلت میں وہ کونسی بنیادی مصلحت ہے جس کی بنا پر اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی؟ اگر تم غور کرو گے تو یہ بات تمہاری سمجھ میں آجائے گی کہ اس قانونِ مہلت میں بھی وہی بنیادی حقیقت کارفرما ہے کہ کسی سے ذہنی اکراہ کی بنا پر کچھ نہیں منوایا جائے گا۔ ذرا سوچو کہ اگر ایسا ہوتا کہ جونہی کوئی چور چوری کے لئے ہاتھ بڑھاتا تو اس کا ہاتھ وہیں شل ہو کر رہ جاتا۔ یا اگر کوئی شخص دوسرے کو فریب دیتا تو وہ زمین میں دھنس جاتا۔ یا جھوٹ بولنے والے کی زبان کالی ہو جایا کرتی۔ یا جو شخص خدا کا انکار کرتا اس کی روزی بند ہو جاتی تو اس سے لوگ چوری، فریب دہی، دروغ گوئی حتیٰ کہ کفر و شرک سے تو باز آجاتے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ ان افعال کو برا سمجھتے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ ڈرتے کہ ایسا کرنے سے وہ فوراً پکڑے جائیں گے۔ لہٰذا اس میں بھی زبردستی کا پہلو آجاتا۔ یہ وجہ ہے کہ (ہماری، تمہاری، سب کی آرزوؤں کے باوجود) خدا کی طرف سے جرائم پر فوری گرفت نہیں ہوتی۔ اعمال اپنے نتائج اسی وقت مرتب نہیں

کر دیتے۔ اگر ایسا ہوتا تو سارا قصہ (جس کے لئے انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا تھا) ختم ہو جاتا اور مشیت کی ساری اسکیم بے معنی ہو کر رہ جاتی۔

ولو یعجل اللہ للناس الشر استعجالھم بالخیر لقضی الیھم اجلھم۔ جس طرح لوگ حصول منافع اور جلب مفاد کے لئے جلدی کرتے اگر اللہ کا قانونِ مکافات انھیں ان کی غلط روش کی سزا دینے میں بھی اسی طرح عجلت کرتا تو ان کا سارا جھگڑا ہی نپٹ جاتا۔ لیکن ہم ایسا نہیں کرتے فنذر الذین لا یرجون لقاءنا فی طغیانھم یعمھون (۱۰/۱۱) ہم کرتے یہ ہیں کہ جو لوگ ہمارے قانونِ مکافات کے سامنے آنے سے گریز کرتے ہیں ہم انھیں ان کی سرکشی کی حالت میں چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی وقت گرفت نہیں کر لیتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسی صورت میں (یعنی فوری گرفت کی صورت میں) انسان ہمارے قانونِ مکافات پر ایمان لے آتا لیکن یہ ایمان مجبوری کا ہوتا۔ دل کی رضا و رغبت سے نہ ہوتا۔ اور مجبوری کے ایمان میں استحکام نہیں ہوا کرتا۔ اس کی مثالیں تمہارے سامنے موجود ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ اذا مس الانسان الضر دعانا لجنبہ او قاعدا او قائما۔ جب انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کھڑا۔ بیٹھا۔ لیٹا ہمارے حضور گڑگڑا کر دعائیں مانگتا ہے اور ایسا نظر آتا ہے کہ یہ پکا مومن بن چکا ہے لیکن فلما کشفنا عنہ ضرہ مر کان لم یدعنا الی ضر مسہ (۱۰/۱۲) جب ہم اس کی تکلیف رفع کر دیتے ہیں تو وہ ہمیں پہچانتا تک نہیں اور یوں پاس سے گذر جاتا ہے جیسے اس نے اپنی تکلیف میں کبھی ہمیں پکارا ہی نہیں تھا۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے اس بیان سے کتنی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ مجبوری کی حالت کا ایمان کبھی ایمانِ محکم نہیں ہوتا۔ ایمانِ محکم وہی ہوتا ہے جو بلا کسی قسم کے جبر و اکراہ کے، دل کی رضا و رغبت سے لایا جائے۔ جب مصیبت اور تباہی سامنے آجائے تو اس وقت کا ایمان، ایمان ہی نہیں ہوتا فلم یک ینفعھم ایمانھم لما رأوا بأسنا (۴۰/۸۵) ہمارے عذاب کو سامنے دیکھ کر ایمان لانے نے انھیں کوئی فائدہ نہ دیا[1]۔ اور یہ بات محض ہنگامی نہیں تھی۔ بلکہ یہ خدا کا اٹل قانون ہے۔ سنت اللہ التی قد خلت فی عبادہ (۴۰/۸۵) یہ خدا کا وہ محکم قانون ہے جو اس کے بندوں کے بارے میں شروع سے چلا آتا ہے۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہوگی کہ قرآن انسانی اختیار و ارادے کو کتنی اہمیت دیتا ہے اور جب وہ کہتا ہے کہ لا اکراہ فی الدین (دین کے معاملہ میں زبردستی کا کوئی کام نہیں) تو وہ اس اکراہ میں کن کن گوشوں کو شامل کر لیتا ہے۔ اسکی رو سے جس ایمان میں ذرا سا بھی اکراہ کا شائبہ ہو وہ ایمان، ایمان ہی نہیں حتیٰ کہ وہ ان اعراب کے بارے میں جو مسلمانوں کی فتوحات دیکھ کر مسلمان ہو گئے تھے کہتا ہے کہ قالت الاعراب آمنا۔ یہ بدوی لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قل لم تؤمنوا۔ ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ ولکن قولوا اسلمنا۔ تم یہ کہو کہ تم ان کی قوت کے سامنے جھک گئے۔ تم نے (SURRENDER) کر دیا۔ ولما یدخل الایمان فی قلوبکم (۴۹/۱۴) ابھی ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں داخل نہیں ہوا۔ ایمان اسی وقت ایمان کہلا سکتا ہے جب وہ دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ انسان بلا کسی جبر و اکراہ کے اپنی عقل و بصیرت کی روشنی میں قرآنی حقائق کو صحیح تسلیم کرے۔ تم دیکھو کہ قرآن اس حقیقت کو کیسے جامع انداز میں پیش کرتا ہے۔

ایک شخص اپنی کوئی بڑی اسکیم پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر اس کے مطابق عمل کیا جائے تو اس سے اس اس قسم کے فوائد حاصل ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ سننے والے اسکی اسکیم کے متعلق اس کے دعوے کی صداقت کو کس طرح تسلیم کریں؟ اس کے تین ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ یا تو یہ کہ سننے والے اسقدر

---

[1] امم سابقہ پر خدا کا کس طرح زلزلوں آندھیوں اور طغیانوں وغیرہ کی شکل میں آیا کرتا تھا اسکے متعلق سلیم کے نام ایک خط میں بحث ہو چکی ہے جو مجموعہ خطوط میں شائع ہو چکا ہے۔

علم و بصیرت رکھتے ہوں کہ وہ اسکیم کے تمام پہلوؤں پر فہم و فراست سے غور کریں اور پھر اس نتیجے پر پہنچیں کہ فی الواقعہ اس قسم کی اسکیم ایسے نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

اور یا سننے والے اتنا انتظار کریں کہ وہ اسکیم عملی طور پر نافذ ہو جائے تو اس کے نتائج خود بتا دیں کہ اسکے پیش کرنے والے کا دعویٰ سچا ہے یا نہیں۔

اور تیسری صورت یہ ہے کہ اگر اس قسم کی کسی اسکیم پر اس سے پہلے کہیں عمل ہوا ہو تو اس کے نتائج کو بطور شہادت کے پیش کر دیا جائے۔

پہلی صورت کو احاطۂ علمی کہا جائیگا، دوسری صورت کو استقرائی طریق (PRAGMATIC TEST) اور تیسری شکل کو تاریخی شواہد۔ دیکھو سلیم! قرآن اپنی صداقت کیلئے کس طرح انہی تین طریقوں کو پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ۔ یہ لوگ اس قرآن کے دعوے کی تکذیب اسلئے کرتے ہیں کہ خود ان کا علم اتنا وسیع نہیں کہ اسکے ذریعہ یہ اس کے حقائق کا علمی احاطہ کر سکیں۔ ولما یاتھم تاویلہ۔ اور ابھی یہ صورت پیدا نہیں ہوئی کہ قرآنی نظام عملاً متشکل ہو کر اپنے نتائج ان کے سامنے لے آیا ہو۔ اب تیسری صورت ہی باقی رہ جاتی ہے کہ ان لوگوں سے کہو کہ اس سے پیشتر بھی یہی قوانین زندگی مختلف قوموں کی طرف آتے رہے اور انھوں نے ان کی تکذیب کی۔ سو تم تاریخی شواہد سے دریافت کرو کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا۔ کذالک کذب الذین من قبلھم فانظر کیف کان عاقبۃ الظالمین (۱۰/۳۹)

سن رہے ہو سلیم! کہ قرآن کسی نظریہ کے پرکھنے کیلئے کیا طریق تجویز کر رہا ہے؟ کیا علم کی دنیا ان پر کسی قسم کا بھی اضافہ کر سکی ہے؟ اور یہ چیزیں کب بیان کی گئیں؟ چھٹی صدی عیسوی میں! اور کس جگہ بیان کی گئیں؟ اس ملک میں جہاں اسوقت نہ کوئی شخص تاریخی شواہد کی اہمیت کو جانتا تھا اور نہ ہی استقرائی اور استنتاجی طرق شہادت کو!! قرآن میں اقوام گذشتہ کے جسقدر احوال و کوائف بیان ہوئے ہیں ان سے مقصد انہی تاریخی شواہد کا پیش کرنا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کسی دوسرے خط میں بیان کرونگا کہ وہ کس طرح ان تاریخی شواہد سے مشترک عناصر (COMMON FACTORS) کو یکجا کرتا ہے اور پھر ان سے کس طرح نتائج اخذ کر کے یہ کہتا ہے کہ دنیا میں جب اور جہاں کہیں اس قسم کی انقلابی دعوت کو پیش کیا گیا اس کا ردّ عمل کیا ہوا۔ مخالفین نے کس طرح اس کا استقبال کیا۔ یہ دعوت کن کن مراحل سے گذری اور بالآخر ان مخالفین کا انجام کیا ہوا۔ اس کے بعد وہ بتاتا ہے کہ جو کچھ پہلے ہوا وہی کچھ اب ہوگا اور اس کے بعد بھی جب کوئی شخص قرآنی دعوتِ انقلاب کو لیکر اٹھے گا تو اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا۔

یہ ہے قرآن کا طریق استدلال جس سے وہ خالص علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی رو سے اپنے دعاوی کی صداقت کو منواتا ہے لہٰذا اس میں زبردستی کو کیا دخل ہو سکتا ہے؟ لیکن اس سے تم کہیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا کہ جو لوگ نظام معاشرہ (سوسائٹی) کے قوانین کو توڑیں انھیں ان کے جرائم کی سزا نہیں دی جائے گی، کیونکہ یہ زبردستی ہو جائے گی۔ قانون شکنی کی سزا دینا نہایت ضروری ہے۔ اس سے معاشرہ کا نظام قائم رہتا ہے۔ لیکن اسلامی نظام کا قیام صرف ان لوگوں کے ہاتھوں سے ہوگا جو بلا کسی جور و اکراہ کے دل کی رضامندی اور ذہن کی موافقت کے ساتھ، اس نظام کی صداقت پر ایمان رکھیں گے۔ جو اس پر اس طرح ایمان نہیں رکھے گا اسے اس نظام کی تشکیل و استحکام کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہوگا نہ ہی وہ اس میں کسی قسم کی دخل اندازی کر سکے گا۔ اسے اس نظام کی صداقت کو تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ البتہ یہ نظام اس کے تمام انسانی حقوق کے تحفظ کا ذمہ دار ہوگا ـــــ اب سمجھ گئے تم کہ قرآنی حقائق کو کس طرح سے سمجھا جاتا اور ان پر کس طرح ایمان لایا جاتا ہے؟ والسلام

پرویز

۱۶ دسمبر ۱۹۵۳ء

مقامِ حدیث

ایک مسلمان کے لئے بنیادی سوال یہ ہے کہ دین کسے کہتے ہیں۔ عام طور پر اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ دین، کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ صلعم کے اندر ہے۔ یعنی قرآن اور حدیث دونوں ملکر دین کی تکمیل کرتے ہیں۔ حدیثوں کے بغیر نہ قرآن سمجھا جا سکتا ہے نہ اس کے احکام پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے احکام مجمل ہیں۔

طلوع اسلام میں اس مسلک پر شروع سے لکھا جاتا رہا ہے۔ دین میں حدیث کا صحیح مقام کیا ہے؟ کیا رسول اللہ صلعم نے حدیثوں کا کوئی مستند مجموعہ امت کو دیا تھا؟ کیا خلفائے راشدین نے کوئی ایسا مجموعہ مرتب کیا تھا؟ اگر نہیں کیا تھا تو کیوں نہیں کیا؟ حدیثیں کب مرتب ہوئیں؟ کس کس نے مرتب کیں؟ ہم تک کیسے پہنچیں؟ ان کے اندر کیا کچھ ہے؟ ان کی رو سے دین کی کیا شکل بنتی ہے؟ اس قسم کے سینکڑوں مباحث تھے جن پر تفصیلی طور پر لکھا گیا اور معترضین کے اعتراضات کا جواب دیا گیا۔ یہ معلومات کا بیش بہا ذخیرہ طلوعِ اسلام کے ہزارہا صفحات میں بکھرا پڑا تھا۔ ضرورت کا تقاضا تھا کہ ان تمام مباحث کو یکجا کر دیا جائے۔ یہ مجموعہ چار چار سو سے زیادہ صفحات کی دو جلدوں میں آیا ہے۔

پہلی جلد

تیار ہے۔ علاوہ محصول ڈاک قیمت مجلد چار روپے۔ جلد منگا لیجئے۔

معاونین حضرات

کو آرڈر بھیجنے کی ضرورت نہیں، ان سب کی خدمت میں کتاب از خود بھیجدی جائے گی۔ البتہ ان میں سے جو حضرات کتاب نہ منگانا چاہیں وہ ہمیں ۱۰ر جنوری تک اطلاع دیدیں۔

——— مقامِ حدیث جلد اول تیار ہو چکی ہے ———

دوسری جلد زیر طبع ہے۔ اگر آپ دونوں جلدیں یکجا منگانا چاہیں تو بھی لکھدیجئے۔ دوسری جلد کی قیمت بھی علاوہ محصول ڈاک چار روپے ہے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

حلقۂ معاونینِ طلوعِ اسلام

طلوع اسلام کی اشاعت بابت جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۵۳ء میں ان ایکسو ساٹھ حضرات کے نام شائع ہو چکے ہیں جنہوں نے ہماری دعوت پر لبیک کہا اور معاونین کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ اسکے بعد جو دیگر احباب حلقۂ معاونین میں (۳۱ دسمبر تک) شامل ہوئے ہیں ان کے اسمار گرامی شکریہ کے ساتھ درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ معاونین کی کل تعداد اسوقت تک ایکسو تہتر ہوئی ہے جو حضرات ابھی تک اس حلقہ میں شامل نہیں ہوئے وہ خود غور فرمائیں کہ قرآنی فکر اور نظام کی اشاعت کی اتنی بڑی اسکیم اس قلیل سی رقم کے ساتھ کس حد تک آگے بڑھ سکے گی۔ اسکیم یہ ہے کہ آپ ایکسو روپے کی رقم (یکمشت یا چار مساوی اقساط میں) ارسال فرمادیں۔ آپ کو رسالہ طلوع اسلام اور ادارہ کی طرف سے شائع ہونے والی تمام کتابیں اسوقت تک بلاقیمت پیش کی جاتی رہیں گی جبتک آپ کی سو روپے کی رقم پوری نہ ہو جائے۔ اگر خدانخواستہ یہ سلسلہ بند کر دینا پڑا تو آپ کی بقایا رقم واپس کر دی جائیگی۔ ہمیں کم از کم ایکہزار معاونین کی ضرورت ہے۔ توقف نہ کیجئے آپ کو کسی قسم کا بھی خسارہ نہیں رہے گا اور آپ کی مدد سے قرآنی فکر اور نظام کی اشاعت کا انتظام ہو جائے گا۔

فہرست معاونین خصوصی ادارۂ طلوع اسلام

رنگون

(۱۶۱) مسٹر عبداللہ ایم ماموں جی - ۳۱/۱۸۰ سٹریٹ

(۱۶۲) ملا ابراہیم صاحب۔ معرفت سورتی ٹریڈنگ کمپنی - ۵۱ - چائنا سٹریٹ

لاہور

(۱۶۳) بشیر احمد خاں صاحب - ریل وے افسر

(۱۶۴) ایم جان محمد صاحب ۹-اے میو گارڈن

(۱۶۵) نام شائع کرنا نہیں چاہتے۔

(۱۶۶) عبداللطیف نظامی صاحب۔ سلیمان بلڈنگ ۲/۳۔ خواجہ دل محمد روڈ

کراچی

(۱۶۷) عارفہ بیگم صاحبہ ۴۔ سگن مل بلڈنگ - موہن روڈ

(۱۶۸) سید یحیٰی شاہ صاحب بی اے۔ معرفت حجاز ہوٹل - نوآباد

(۱۶۹) اے۔ آر خاں صاحب۔ ۴۹/۴ اجمل خاں روڈ۔ متصل تھانہ نیو ٹاؤن

سرگودھا

(۱۷۰) محمد الیاس ملک

مردان

(۱۷۱) محمد صادق گل زماں خاں صاحب۔ فضل آباد

⊕ شیخ عطا الٰہی صاحب

سیالکوٹ

(۱۷۲) خان بخت جمال خاں صاحب۔ چوک گرین وڈ سٹریٹ

(۱۷۳) رب نواز صاحب - اسلام آباد۔

⊕ یہ نام طلوع اسلام کی فہرست کے نمبر (۱۳۱) کے سامنے پڑھئے۔

عہد نبوی میں قرآن مجید کی تدوین و ترتیب

(از جناب مولانا سید بدرالدین صاحب علوی استاد شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی)

[قارئین کو یاد ہوگا کہ طلوع اسلام میں یہ اہم سوال شائع ہوتا رہا ہے کہ اگر احادیث نبوی دین کا جزو تھیں۔ اگر یہ قرآن کی ایسی تفسیر تھیں جن کے بغیر نہ قرآن سمجھ میں آسکتا ہے نہ اس پر عمل ہو سکتا ہے تو رسول اللہ صلعم کے لئے ضروری تھا کہ انھوں نے جس طرح قرآن کریم کو مرتب کر کے امت کو دیا اسی طرح سے وہ اپنی احادیث کا مستند اور مصدقہ مجموعہ بھی مرتب فرما کر امت کو دے جاتے تاکہ امت کو معلوم ہو جاتا کہ انھوں نے کس چیز پر عمل کرنا ہے۔ اور دین کے مستند اجزاء کیا ہیں؟

طلوع اسلام نے ان تمام حضرات سے درخواست کی جو احادیث کو دین کا جزو مانتے ہیں کہ وہ اس سوال کا جواب دیں۔ ان حضرات میں سے کسی نے آج تک اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ جمعیت اہل حدیث کراچی کے صدر مولانا محمد یوسف صاحب نے البتہ ایک جواب بھیجا جس کی تردید علامہ تمنا عمادی نے کی۔ یہ جواب اور اس کی تردید طلوع اسلام بابت نومبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ مولانا یوسف صاحب نے اپنے جواب میں جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا تھا (اور یہی بات اہل حدیث حضرات کے کئی اور گوشوں سے بھی سننے میں آئی) وہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلعم نے قرآن کو بھی خود مرتب کر کے امت کو نہیں دیا تھا۔ اسلئے طلوع اسلام کے اعتراض کا کوئی وزن ہی نہیں رہتا۔ اس کے جواب میں طلوع اسلام میں ایک تفصیلی مقالہ شائع کیا گیا کہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں قرآن ایک مدون اور مرتب شکل میں موجود تھا۔ (دیکھئے طلوع اسلام بابت نومبر ۱۹۵۳ء)

اب ہمارے سامنے ایک ایسا مضمون آیا ہے جس میں صاحب مضمون نے یہ بتایا ہے کہ خود روایات سے بھی یہ ثابت ہے کہ قرآن کریم رسول اللہ صلعم کے زمانے میں مکمل طور پر مرتب ہو چکا تھا۔ یہ مقالہ مجلۂ معارف اعظم گڈھ بابت ستمبر و اکتوبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا ہے۔ ہم اس مقالہ کی افادیت کے پیش نظر اسے مجلہ معارف کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کرتے ہیں۔ طلوع اسلام]

قرآن مجید کا پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونا اور اس کی ہدایت اور اس کے احکام کا بغیر حذف و کمی اور بغیر تغیر و تبدل ہمیشہ قائم رہنا لازمی طور پر اس کا مقتضی تھا کہ وہ عہد نبوت ہی میں مرتب ہو کر کتابی صورت میں آجائے تاکہ اصلی معنوں میں محفوظ ہو جائے اور حذف و ترمیم اور تغیر و تبدل کا شبہ ہی مٹ جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ کتاب کی صورت میں مرتب ہو کر نبی کریم صلعم

کے زمانے میں تیار ہوگیا تھا اور اس کی مکمل کتابت ہو چکی تھی، جس کی ترتیب وہی تھی جو آج ہے۔ مندرجہ ذیل واقعات اس امر کیلئے ناقابلِ تردید دلائل ہیں۔

۱۔ قرآن مجید خود اپنے آپ کو بہت سے مقامات پر حتیٰ کہ مکی سورتوں میں بھی کتاب کے نام سے یاد کرتا ہے، مثلاً

(۱) کتاب فصلت اٰیاتہ، (مکی)

یعنی یہ وہ کتاب ہے کہ جس کی آیتیں واضح کر دی گئی ہیں۔

(۲) الحمد للہ الذی انزل علیٰ عبدہ الکتاب (مکی)

یعنی سب تعریفیں خدا ہی کے لئے ہیں جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی۔

(۳) ذالک الکتٰب لا ریب فیہ (مدنی)

یعنی یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

(۴) یعلمھم الکتاب والحکمۃ (مدنی)

یعنی پیغمبر، لوگوں کو کتاب و حکمت سکھاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

لفظ کتاب کا استعمال مکی سورتوں میں اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ قرآن مجید آغاز ہی میں کتابی صورت میں مرتب ہونا شروع ہو گیا تھا۔

۲۔ قرآن مجید نے جہاں اپنے خلاف کفار کے اعتراضات کو بیان فرمایا ہے، ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ

قالوا اساطیر الاولین اکتتبھا۔

یعنی کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن پچھلے لوگوں کی کہانیوں کا مجموعہ ہے جسکو پیغمبر نے لکھا دیا ہے۔

یہ اعتراض بزمانۂ نزول صرف اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ترتیب پاکر لکھا جاتا تھا۔

احادیث و سیر سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ قرآن مجید کی تحریر و ترتیب عہد نبوی میں شروع ہو گئی تھی اور وہ اسی زمانے میں مرتب ہو گیا تھا۔ مثلاً

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ میں سے بہت سے لوگوں کو کتابت وحی کے کام پر مقرر فرما دیا تھا چنانچہ اس قسم کے ۳۸ اڑتیس صحابۂ کرامؓ کی فہرست محدث ابن سید الناس (المتوفی ۷۳۴ھ) نے اپنی کتاب مسمی "عیون الاثر" جلد دوم ص ۳۱۵ و ۳۱۶ پر دی ہے جو قرآن لکھا کرتے تھے۔ السیرۃ الحلبیہ کی جلد دوم ص ۳۲۶ پر بیس کاتبین وحی کے نام درج ہیں۔ ان ناموں کو مصنف نے ایک روایت کی رو سے چھبیس ۲۶ اور ایک روایت کی رو سے بیالیس کاتبین کے ناموں میں سے انتخاب کیا ہے۔ اس فہرست میں خلفائے اربعہؓ، حضرت معاویہؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، زید بن ثابت وغیرہ شامل ہیں۔ حضرت معاویہؓ کا کاتبین وحی میں ہونا مجمع الزوائد جلد اول ص ۶۰، ۶۱، اور صحیح مسلم مصری جلد دوم ص ۲۶۴ سے بھی ثابت ہے، جہاں یہ مذکور ہے کہ ان کے والد ابو سفیان نے رسول اللہ صلعم سے درخواست کی تھی کہ ان سے کتابت کا کام لیا جائے چنانچہ حضورؐ نے اس کو منظور فرمایا ہے۔

۴ — جب کوئی وحی نازل ہوتی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کاتبین وحی کو منفرداً یا مجتمعاً جیسی صورت ہوتی طلب فرماتے اور خود بول کر ان کو وحی لکھوا دیتے، ان واقعات کا ثبوت یہ ہے:

(الف) قال عثمان کان اذا انزل علیہ الشی دعا بعض من یکتبہ۔ (ترمذی جلد ۲ ص ۱۳۴ مطبوعہ دہلی)

یعنی جب وحی نازل ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاتبوں میں سے کسی کو لکھنے کے لئے بلاتے۔

(ب) عن البراء لما نزل لا یستوی القاعدون الخ دعا رسول اللہ زیدا فکتبھا (صحیح بخاری مصری جلد ۳ ص ۷۶)

یعنی حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ جب آیت لا یستوی القاعدون الخ نازل ہوئی تو آنحضرت صلعم نے زید کو بلایا اور انھوں نے اس آیت کو لکھ لیا۔

(ج) عن زید بن ثابت ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم املی علیہ لا یستوی القاعدون (ایضاً)

یعنی خود زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت لا یستوی القاعدون مجھے بول کر لکھائی۔

(د) عن عبد اللہ ابن عمر واذ نحن عند رسول اللہ نکتب الخ (سنن دارمی ص ۶۸)

یعنی عبداللہ بن عمروؓ (جو کہ کاتبین وحی میں ہیں) فرماتے ہیں کہ در آنحالیکہ ہم لوگ (جماعت کاتبین) رسول اللہ صلعم کے گرد کتابت میں مصروف تھے۔

۵ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید لکھوانے کے بعد فرماتے تھے کہ آپ کو پڑھ کر سنایا جائے تاکہ اگر کوئی غلطی ہو گئی ہو تو اس کو درست کرا دیں، چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے۔

فاذا فرغت قال اقرأ فاقرأہ فان کان فیہ سقط اقامہ (مجمع الزوائد ج اول ص ۶۰)

یعنی جب میں لکھ چکتا تو حضرت فرماتے کہ پڑھو، میں پڑھتا، اگر اس میں کوئی غلطی ہوتی تو آپ اس کو درست فرما دیتے۔

۶ — جس وقت آنحضرت صلعم کاتبین وحی کو قرآن مجید لکھواتے، تو یہ بھی ہدایت فرماتے کہ آپ کی بتلائی ہوئی ترتیب پر لکھیں۔

(الف) ترتیب آیات کے متعلق یہ ارشاد وضاحت کے ساتھ احادیث میں مذکور ہے۔ چنانچہ ترمذی میں ہے:

فیقول ضعوا ھذہ الایات فی السورۃ التی یذکر فیھا کذا وکذا۔ (ترمذی ج ۲ ص ۱۳۴)

یعنی ان آیتوں کو اس سورت میں لکھو جس میں فلاں فلاں باتیں بیان کی گئی ہیں۔

اس حدیث میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر سورت جدا جدا لکھی جاتی تھی۔ (ب) سنن ابی داؤد کی حسب ذیل حدیث اس کا ثبوت ہے کہ سورتوں کی ترتیب عہد نبوی میں ہو چکی تھی۔

عن حذیفۃ انہ رای النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اللیل . . . فصلی اربع رکعات فقرء فیھن البقرۃ و آل عمران والنساء والمائدۃ والانعام (ملخصاً) (سنن ابی داؤد جلد اول ص ۱۲۸ مطبوعہ نولکشور)

یعنی حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رات میں چار رکعت نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور آپؐ نے ان میں سورۂ بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ اور انعام پڑھیں۔

اس حدیث میں ان سور قرآنی کی ترتیب وہی ہے جو موجودہ قرآن مجید میں ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بقیہ سورتوں کی ترتیب بھی یقیناً عہد نبوی میں ہوگی، اس حدیث کے علاوہ عہد نبوی میں قرآن مجید اور اس کی سورتوں کے مرتب ہو جانے کی شہادت دوسری احادیث سے بھی ملتی ہے۔

۱۔ ترمذی میں ہے:

عن ابن عباس قال قال رجل یارسول اللہ ای العمل احب الی اللہ قال الحال المرتحل (ترمذی ص۱۱۸ و ۱۱۹ ج۲)

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے پوچھا کہ کونسا عمل اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے، آپ نے فرمایا سفر سے اترنا، اور سفر کرنا۔

دارمی کی روایت میں اتنا اضافہ ہے:

قیل ما الحال والمرتحل قال صاحب القرآن یقرء من اول القرآن الی اخرہ ومن اخرہ الی اولہ کلما حل ارتحل (دارمی ص۴۴۱)

یعنی پوچھا گیا کہ سفر سے اترنے اور پھر سفر کرنے کا کیا مطلب ہے، آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ قرآن پڑھنے والا جو اول سے آخر تک تلاوت کرتا ہے اور ختم کر لیتا ہے تو دوبارہ شروع کر دیتا ہے۔ گویا جیسے ہی تلاوت کا سفر ختم کرتا ہے ویسے ہی دوسرا سفر تلاوت کا شروع کر دیتا ہے۔

اس حدیث میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ شروع اور ختم جب ہی ہو سکتا ہے جب پورا قرآن مجید مرتب ہو۔

۲۔ صحابہ کرامؓ کے اس استفسار پر کہ قرآن مجید کو کتنے دنوں میں ختم کرنا چاہئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف تحدیدیں بیان فرمائی ہیں جو پانچ دن سے لیکر چالیس دن تک ہیں۔ ترمذی میں ہے۔

عن عبد اللہ ابن عمرو قال قلت یارسول اللہ فیکم اقراء القرآن قال اختمہ فی شھر قلت انی اطیق افضل ذالک قال اختمہ فی عشرین .... اختمہ فی خمس قلت انی اطیق افضل من ذلک فما رخص لی (ص۱۱۸ ج۲)

یعنی عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں کتنے دنوں میں قرآن ختم کروں، آپ نے فرمایا تیس دن میں، میں نے پھر عرض کیا میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں، فرمایا کہ بیس دن میں۔ میں نے پھر عرض کیا، میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں، فرمایا کہ دس دن میں (بالآخر فرمایا) کہ پانچ دن میں ختم کرو۔ میں نے پھر عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ طاقت رکھتا ہوں، مگر آپؐ نے اور کمی کی اجازت نہیں دی۔

ایک اور روایت انہی عبداللہ ابن عمروؓ سے ترمذی کے اسی صفحہ پر مروی ہے۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لمن اقرء القرآن فی اربعین۔

یعنی آنحضرت صلعم نے ان کو چالیس دن میں قرآن ختم کرنے کی ہدایت فرمائی۔

یہ تمام حدیثیں جو ختم کے متعلق ہیں، اس عہد میں قرآن مجید کے مرتب ہونے پر دلالت کرتی ہیں، کیونکہ بغیر ترتیب نہ ابتداء ہو سکتی ہے

نہ اختتام۔ غرض اس طریقہ پر کاتبین وحی کے لکھے ہوئے متعدد نسخے عہدِ نبوی میں وجود میں آچکے تھے، جن میں اس وقت تک کی نازل شدہ آیات وسورتیں مرتب تھیں اور آگے اضافہ ہوتا جاتا تھا، چار صحابہ کرامؓ کے مرتب کردہ چار نسخوں کا ثبوت صحیح بخاری مصری جلد سوم ص ۱۴۳ اور صحیح مسلم مصری جلد سوم ص ۲۵۲ سے ملتا ہے۔ یہ نسخے حضرت معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ اور ابوزیدؓ کے تھے، اس عہد کے ان چار مرتب نسخوں پر دو نسخوں کا اضافہ رجال وطبقات کی کتابوں کے بیان سے ہوتا ہے۔ ایک تہذیب التہذیب جلد ہفتم ص ۲۴۳ کی سند سے جو حضرت عقبہؓ ابن عامر الجہنی کا تھا اور دوسرا حضرت سعد بن عبیدؓ کا جس کا ذکر استیعاب جلد دوم ص ۵۶۵ پر ہے۔

ان اقتباسات کی بنیاد پر چھ نسخوں کا وجود عہد نبوی میں ثابت ہوتا ہے۔

طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۱۱۲ میں اس عنوان کے ماتحت کہ" ان لوگوں کا ذکر جنھوں نے رسول اللہ صلعم کے عہد میں قرآن جمع کر لیا تھا" مکررات کو چھوڑ کر تین روایتوں میں دس صحابہؓ کے نام گنائے ہیں، ان میں چار تو وہی ہیں جو اوپر صحیح بخاری وصحیح مسلم کے حوالہ سے بیان ہوئے، پانچواں نام سعد بن عبیدؓ کا ہے جو استیعاب میں مذکور ہے۔ اس کے بعد پانچ دوسرے نام یہ ہیں حضرت ابوالدرداءؓ، خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ، تمیم داریؓ، عبادہ بن الصامتؓ اور ابوایوب انصاریؓ، خلیفہ چہارم حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ بھی جامعینِ عہدِ نبوی میں ہیں، چنانچہ استیعاب میں ہے:

روی ربیعۃ بن عثمان عن محمد بن کعب القرظی قال کان ممن جمع القرآن علی عھد رسول اللہ وھو حی عثمان ابن عفان وعلی ابن ابی طالب وعبد اللہ ابن مسعود من المھاجرین وسالم مولیٰ ابن حذیفہ (۲۶ / ۴۶۵)

یعنی ربیعہ بن عثمان نے محمد ابن قرظی سے روایت کی ہے کہ جن لوگوں نے عہد نبوی میں جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے قرآن اکٹھا کیا، ان میں سے عثمان بن عفانؓ، علی بن ابی طالبؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ بھی شامل ہیں۔

اس طور پر جملہ میزان مرتب نسخوں کی تیرہ ہو جاتی ہے، اس فہرست میں مجھے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے نام نہیں ملے لیکن چونکہ یہ حضرات بلا شبہ کاتبین وحی میں داخل ہیں، اس لئے اس کا یقین کامل ہے کہ انھوں نے بھی نسخے تیار کئے ہوں گے۔

گو اس بات کا بھی یقین ہے کہ جتنی تعداد کاتبین وحی کی تھی، اتنے ہی نسخے قرآن مجید کے مرتب ہوئے ہوں گے لیکن باوجود اس یقین کے میں ان کو شمار نہیں کرتا، مگر ذیل میں بعض ایسے واقعات پیش کئے جاتے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے بہت سے مرتب نسخے عہد نبوی میں موجود تھے، جن کو آنحضرتؐ نے بعد وفات چھوڑا۔

۱۔ صحیح مسلم میں ہے:۔

نھی رسول اللہ ان یسافر بالقرآن الی ارض العدو۔ (مسلم ۹۳ / ۲ج)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں قرآن مجید کے نسخوں کو غنیم کے ملک میں لےجانے سے منع فرمایا۔

۲۔ موطا امام مالک کے باب الامر بالوضوء لمن مس القرآن میں ہے۔

مالك عن عبد الله ابن ابی بکر ابن حزم ان فی الکتب الذی کتبہ رسول اللہ لعمرو ابن حزم ان لا یمس القرآن الا طاھر۔ (مؤطا امام مالک ص۹۹ مطبوعہ مصر)

یعنی جو شخص قرآن چھونا چاہے، اس کے لئے وضو کا حکم ہے، امام مالک عبداللہ ابن ابی بکر بن حزم سے روایت کرتے ہیں کہ ان ہدایات میں جو آنحضرت صلعم نے ابن حزم کیلئے تحریر فرمائیں یہ بھی تھا کہ کوئی شخص قرآن مجید کو بغیر وضو کے ہاتھ نہ لگائے۔

۳۔ کنز العمال میں ہے:

لا تغرنکم ھذہ المصاحف المعلقۃ: (کتاب مذکور جلد اول ص ۱۳۴)

(یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جگہ قرآن مجید کے نسخے لٹکے ہوئے دیکھکر فرمایا) کہ اے لوگو تم ان سے دھوکہ میں نہ پڑ جانا، یعنی محض ان کا پڑھنا ہی کافی نہیں، بلکہ عمل کی بھی ضرورت ہے۔

۴۔ سنن ابی داؤد میں ہے:

انی قد ترکت فیکم ما ان تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ کتاب اللہ (سنن ابی داؤد جلد اول ص۲۶۵ مطبوعہ نولکشور

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہارے اندر ایک ایسی چیز (قرآن) چھوڑے جاتا ہوں جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہیں ہو سکتے اگر تم اس کو مضبوط پکڑ لو۔

یہ فرمانا اسی وقت درست ہو سکتا ہے کہ جب قرآن مجید کتابی صورت میں ہر شخص کی دسترس کے اندر ہو۔

۵۔ صحیح بخاری میں ہے:

عن عبد العزیز بن رفیع قال دخلت انا و شداد بن معقل علی ابن عباس فقال لہ شداد بن معقل اترک النبی من شئ قال ما ترک الا ما بین الدفتین قال ودخلنا علی محمد بن الحنفیۃ رسالناہ فقال ما ترک الا ما بین الدفتین۔ (بخاری جلد ۳ ص ۱۴۳)

یعنی عبد العزیز بن رفیع کہتے ہیں کہ میں اور شداد ابن معقل حضرت ابن عباسؓ کے پاس گئے تو شداد نے ان سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلعم نے کوئی چیز ترکہ میں چھوڑی ہے، انھوں نے جواب دیا نہیں، بجز اس کے کہ جو دو ٹھپوں کے درمیان ہے، پھر ہم محمد بن الحنفیہ کے پاس گئے اور یہی سوال کیا تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی چیز نہیں چھوڑی بجز اس کے جو دو ٹھپوں کے درمیان ہے۔

ان دونوں جوابوں سے علاوہ قرآن مجید بصورت کتاب لکھے ہونے کے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جلد بندی کا دستور ہو چکا تھا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ

(الف) کیا فن تحریر اس زمانے میں ایسا عام ہو چکا تھا کہ قرآن مجید کے مکتوبہ نسخوں کا بکثرت پایا جانا فرض کیا جا سکتا ہے۔

(ب) اور اس مقصد کے لئے کاغذ دستیاب ہوتا تھا۔ خود قرآن مجید ہی سے اس کا جواب مل جاتا ہے۔

(الف) ایک مقام پر حکم خداوندی ہے۔

یا ایھا الذین اٰمنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوہ ۔

یعنی اے ایمان والو جب تم کوئی قرض کا معاملہ کرو جو مدت معینہ کیلئے ہو تو لکھ لیا کرو۔

اس عام حکم سے بہت وضاحت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ فن تحریر اتنا عام تھا کہ ہر شخص ہر وقت اس کا انتظام کر سکتا تھا

اس فن کے مروج ہونے کا مزید ثبوت حسب ذیل امور سے بھی ملتا ہے۔

۱ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے ممالک کے بادشاہوں کے نام تبلیغی خطوط بھیجے تھے۔ صحیح مسلم میں ہے:

لما اراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یکتب الی الروم قالوا انھم لا یقرؤن کتابا الا مختوما فاتخذ رسول اللہ خاتما من فضۃ ۔ (صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۵۸)

یعنی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں کو خط لکھنے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے بتایا کہ وہ لوگ خط کو اس وقت تک نہیں پڑھتے جب تک اس پر مہر نہ لگی ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے حضورؐ نے ایک چاندی کی انگوٹھی تیار کرائی۔

۲ — حدیبیہ کے صلحنامہ کی کتابت اتنی ثابت شدہ ہے کہ اس کے لئے کسی حوالہ کی ضرورت نہیں۔

۳ — صحیح مسلم میں ہے کہ

لا تکتبوا عنی غیر القرآن (ج ۲ ص ۳۹۳)

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بجز قرآن کے مجھ سے اور کوئی چیز نہ لکھو۔

اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ لکھنا عام تھا اور بہت سے لوگ اس کو جانتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ایک طریقہ جاری ہو گیا تھا کہ لوگ قرآن مجید کو آنحضرت صلعم کے بولنے پر لکھا کرتے تھے۔

۴ — صحیح بخاری میں ہے۔

اکتبوا لی من تلفظ بالاسلام (ج ۲ ص ۱۱۲)

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے واسطے ان لوگوں کے نام لکھو جنہوں نے اسلام قبول کیا ہے۔

۵ — تاریخی واقعہ مندرجہ طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۱۴۔ کہ اسیران بدر جو فدیہ نہ دے سکتے تھے ان کی رہائی کی یہ شرط قرار دی گئی کہ ان میں کا ہر شخص مسلمانوں کے دس دس لڑکوں کو لکھنا سکھا دے۔

۶ — فقال الا تعلمین ھذہ رقیۃ المدلۃ کما علمتھا الکتابۃ

(یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شفا بنت عبداللہ سے) فرمایا کہ تو نے حفصہؓ کو چیونٹیوں کے کاٹنے کا جھاڑنا کیوں نہیں بتلایا، جیسا کہ تو ان کو لکھنا سکھا چکی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عورتیں بھی لکھنا جانتی تھیں۔

(ب) اس دور میں کاغذ کی دستیابی خود قرآن مجید سے ثابت ہے، ارشاد ہے:

ولو نزلنا علیک کتابًا فی قرطاس فلمسوہ بایدیھم لقال الذین کفروا ان ھذا الا سحر مبین۔

یعنی اگر ہم آپ کے اوپر کوئی کتاب کاغذ پر لکھی ہوئی نازل کرتے اور لوگ اس کو اپنے ہاتھوں سے چھوتے تو کفار یہ کہدیتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

غرض کاغذ کی دستیابی میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ کاغذ عام طور پر دستیاب نہ ہوتا رہا ہو لیکن اس کی قائم مقام کوئی اور چیز مثلاً چمڑا، یا اونٹ کی ہڈی وغیرہ آسانی سے مل جاتی تھی، چنانچہ چمڑے کا استعمال زمانہ جاہلیت کی شاعری میں مذکور ہے، جیسا کہ مرقش اکبر کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

الدار قفر والرسوم کما رقش فی ظھر لاٰدیم قلم

یعنی معشوقہ کا مکان ویران پڑا ہے، لیکن نشانات ایسے نمایاں ہیں، جیسے چمڑے پر قلم نقش بناتا ہے۔

غرض یہ شبہ سے بالاتر حقیقت ہے کہ قرآن مجید کتابی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مرتب کر لوگوں میں رائج ہو چکا تھا، البتہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ آیا موجودہ قرآن کی آیتوں اور سورتوں کی ترتیب وہی ہے جو آنحضرت صلعم نے قرار دی تھی؟ اس کا جواب اثبات میں ہے، اور اس کے حسب ذیل چار دلائل ہیں۔

۱۔ سب سے مقدم اور سب سے زیادہ مضبوط دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید کی نقل بذریعہ تواتر ہے۔ یعنی ہر زمانے میں ایک ایسی بڑی جماعت نے اپنے بعد والوں کو قرآن مجید پہنچایا ہے، جس کے افراد مختلف نسلوں اور مختلف جگہوں کے لوگ تھے جو ایک دوسرے سے طویل مسافت پر بستے تھے اور پھر مختلف زمانوں میں تھے۔ اور عقل کے نزدیک غیر ممکن ہے کہ اس اختلاف نسل اور اختلاف زمان و مکان کے باوجود سب لوگ کسی جھوٹ کو پھیلانے پر متفق ہو جائیں۔ تواتر کو قرآن مجید کے ساتھ اتنا ربط ہے کہ قرآن مجید کی تعریف ہی بلا استثناء تمام اسلامی فرقوں میں یہ قرار پائی ہے کہ قرآن اس کتاب کا نام ہے جو دو دفتیوں کے اندر بنقل تواتر چلی آ رہی ہے، علم اصول فقہ کی رو سے تواتر کو وہ قوت حاصل ہے کہ جو خبر احاد سے ہرگز متزلزل نہیں ہو سکتی (خبر احاد تواتر کا مقابل ہے جس کے معنی انفرادی طور پر نقل کرنے کے ہیں) چاہے اس خبر آحاد کو کتنی ہی بڑی طاقت و اعتبار حاصل ہو۔

قرآن مجید کے ذریعے تواتر نقل کا بیان درج ذیل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ تنہا بلا شرکت غیر نازل فرمایا تھا اس لئے تنہا آپ ہی کو اس کا حق تھا کہ خود زبان مبارک سے بول کر ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ اس کو جمع کریں، اور لکھوائیں، اور آپ نے ایسا ہی کیا۔ اسی طرح مومنین کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کا حق بھی اپنی دی ہوئی ترتیب کے ساتھ تنہا آپ ہی کو تھا، چنانچہ آپ لوگوں کو اس کے پڑھنے اور یاد کرنے کی ترغیب دلاتے تھے جن کی بکثرت حدیثیں موجود ہیں، مگر بنظرِ اختصار یہاں صرف ایک حدیث کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

مثل الذی یقرء القرآن وھو حافظ لہ مع السفرۃ الکرام - (صحیح بخاری ۱۳۲/۲۲)

یعنی جو شخص قرآن کو پڑھتا ہے، ایسی صورت میں کہ اس کا حافظ بھی ہے تو ایسا شخص باعظمت فرشتوں کے ساتھ ہوگا۔

ان ترغیبات کے سوا ایک اور بڑی وجہ قرآن مجید کے یاد کرنے اور پڑھنے کی یہ ہے کہ پنج وقتہ نماز میں اس کی تلاوت فرض ہے، اور عہد رسالت میں ہر مومن کے لئے لازمی تھا کہ وہ اپنے سینہ میں اس وقت تک کی نازل شدہ وحی کو محفوظ رکھے جو رسول اللہ صلعم کی دی ہوئی ترتیب پر ہو۔ چنانچہ ہر مسلمان اس بات کی انتہائی کوشش کرتا تھا کہ وہ براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کو حاصل کرے، اگر کتابت نہ جانتا ہو تو محض حفظ کے لئے ورنہ حفظ و تحریر دونوں کے لئے۔ رسول اللہؐ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دینے کے بعد ان سے فرمائش کرتے تھے کہ وہ آپ کے سامنے اس کو پڑھیں اور جب لوگ پڑھتے تو آپ اس کو سنتے۔

یہ تو خود قرآن سے ثابت ہے کہ لوگ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی تعلیم حاصل کرتے تھے، چنانچہ ارشاد ہے۔ و یعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ

لقد اخذت من فی رسول اللہ بضعا وسبعین سورۃ - (جلد سوم ص۱۴۱)

یعنی میں نے خود آنحضرت صلعم کی زبان مبارک سے تقریباً اناسی سورتیں یاد کیں۔

اس حدیث میں پورے قرآن کی تفصیل مذکور نہیں، لیکن ابن مسعودؓ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پورا قرآن حاصل کرنے کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں، ان میں سب سے زیادہ قوی یہ ہے کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معلم قرآن مقرر فرمایا اور ان کا نام سب سے پہلے رکھا اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمائش کرکے ان سے قرآن سنتے تھے۔ صحیح مسلم میں ہے:

قال رسول اللہ اقرأ علی القرآن فقلت أأقرء علیک وعلیک انزل قال انی اشتھی ان اسمعہ من غیری فقرأت النساء۔ (صحیح مسلم جلد اول ص ۱۲۱)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ مجھ کو قرآن پڑھ کر سناؤ۔ میں نے کہا کہ کیا میں آپ کو پڑھ کر سناؤں درانحالیکہ وہ آپ ہی پر نازل ہوا ہے، تو آپ نے فرمایا میں دوسرے لوگوں سے سننے کی خواہش رکھتا ہوں، اس پر میں نے سورۂ نساء تلاوت کی۔

اس طریقہ پر صحابہؓ کی اکثریت قرآن مجید کے حفظ و تعلیم میں مشغول تھی جن میں خلفائے اربعہ تقدم کا حق رکھتے تھے، کیونکہ ان حضرات کو ہر اس چیز کے ساتھ غایت درجہ کا شوق اور غیر معمولی توغل تھا جو دین سے تعلق رکھتی تھی۔ مندرجہ ذیل واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں۔

۱ــ (الف) حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی "من یعمل سوء یجز بہ" تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابوبکر جو آیت نازل ہوئی ہے کیا وہ تمہیں نہ پڑھاؤں۔ میں نے کہا ہاں۔ تو وہ آپ نے مجھے پڑھائی (ترمذی ج ۲ ص ۱۲۹)

(ب) استدل الامام ابوالحسن الاشعری (المتوفی ۳۲۴ھ) علی حفظہ القرآن بدلیل لا یرد وھو انہ قال یؤم القوم اقرأھم لکتاب اللہ واکثرھم قرانا وتواتر عنہ انہ قدمہ للامامۃ (اتقان ص ۲۱۸)

یعنی امام ابوالحسن اشعری نے حضرت ابوبکرؓ کے حافظ قرآن ہونے پر ایک ایسی دلیل پیش کی ہے جو کہ رد نہیں کی جا سکتی اور وہ یہ ہے

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ لوگوں کی امامت ایسے شخص کو کرنی چاہئے جو قرآن کا قاری ہونے کے اعتبار سے ان سب میں بہتر ہو، اور جس کے سینے میں قرآن سب سے زیادہ ہو۔

یہ ہدایت اور اس کے بعد آپ کا فعل جو بذریعہ تواتر ثابت ہے کہ آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو امامت کے لئے آگے بڑھایا ایک بہت مضبوط دلیل ہے کہ جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

قال ابو العالیۃ قرأت القرآن علیٰ عمر اربع مرات۔ (مفتاح السعادہ جلد اول ص۳۴۹)

یعنی ابو العالیہ کہتے ہیں کہ میں نے قرآن مجید کا دور حضرت عمرؓ کے روبرو چار مرتبہ کیا۔

۳۔ کان (عثمان) یختم القرآن فی رکعۃ واحدۃ (استیعاب جلد۲ ص ۲۴۹)

یعنی حضرت عثمانؓ ایک ہی رکعت میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے۔

۴۔ عن ابی عبد الرحمٰن السلمی قال ما رأیت اقرأ من علی۔ (استیعاب جلد۲ ص ۴۷۶)

یعنی ابو عبد الرحمٰن السلمیؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے بڑھ کر کوئی قرآن کا قاری نہیں دیکھا۔

بہرحال سیکڑوں بلکہ ہزاروں آدمیوں نے قرآن مجید کو براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا جن میں بہت سارے ایسے حضرات ہیں جو خصوصیت کے ساتھ اس میں شغف رکھتے تھے، اور یہ لوگ بطور معلم لوگوں کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کے لئے مقرر ہوئے ان میں سے چار معلموں کا تقرر صحیح بخاری جلد سوم ص ۱۴۱ و صحیح مسلم جلد دوم ص ۲۵۲، اور ترمذی جلد دوم ص ۲۲۲ سے ثابت ہے، ان سب کتابوں میں یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن مسعودؓ، سالمؓ، معاذ بن جبلؓ اور ابی بن کعبؓ کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کے لئے مقرر فرمایا، ان چاروں اصحابؓ نے بعض دوسرے صحابہؓ کے ساتھ جو اسی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے تھے (کیونکہ چار کی تعداد ناکافی ہے) بیشمار اشخاص کو عہد نبوی میں اور آپ کے بعد مختلف مقامات پر قرآن مجید کی تعلیم دی، یہ امور حسب ذیل واقعات سے واضح ہوتے ہیں۔

۱۔ عبادۃ ابن الصامت کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یشغل فاذا قدم الرجل مھاجرا.... دفعہ الی رجل منا یعلمہ القرآن۔ (کنز العمال ج اول ص ۲۳۱)

یعنی عبادہ بن الصامتؓ کہتے ہیں کہ اگر رسول اللہ مشغول ہوتے، اور کوئی آدمی ہجرت کر کے آتا تو آپ اس کو ہم انصار میں سے کسی کے سپرد کر دیتے کہ اس کو قرآن پڑھا دے۔

۲۔ استیعاب جلد اول ص ۳۶۹ میں ہے کہ آپ نے قبائل قارہ اور عضل کو قرآن پڑھانے کے لئے چھ اصحاب مقرر فرمائے اصل عبارت یہ ہے:

"النفر الستۃ الذین بعثھم رسول اللہ الی رھط من عضل والقارۃ فی سنۃ ثلاث من الھجرۃ لیفقھوھم فی الدین ویعلموھم القرآن وھم عاصم ابن ثابت ومرثد ابن ابی مرثد وخبیب ابن عدی

وخالد ابن البکیر وزید ابن الدثنہ وعبد اللہ ابن طارق۔

۳۔ سنہ ہجری میں قبیلہ بنی الحارث کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کے واسطے خالد بن ولیدؓ کو مقرر فرمایا بعث فیہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خالد ابن الولید الی بنی الحارث۔۔۔۔ علمہم کتاب اللہ (طبری ج ۳ ص ۱۵۶ مطبوعہ مصر)

۴۔ یزید بن ابی سفیان کی درخواست پر جو عہد فاروقی میں شام کے گورنر تھے، حضرت عمرؓ نے معاذؓ، عبادہؓ اور ابو الدرداؓ کو حمص، دمشق اور فلسطین میں قرآن شریف کی تعلیم کے لئے روانہ فرمایا، اس قسم کے تقررات کی شہادت اور روایتوں سے بھی ملتی ہے، جن کی تفصیل تطویل کا باعث ہوگی۔

۵۔ طبقات القراء ذہبی میں ہے:

قال سوید ابن عبد العزیز کان ابو الدرداء اذا صلی الغداۃ فی جامع دمشق اجتمع الناس للقرأۃ علیہ فکان یجعلہم عشرۃ عشرۃ وعن مسلم بن مشکم قال قال لی ابو الدرداء اعدد من یقرء عندی القرآن فعددتہم الفا وستمائۃ ویزیدون (طبقات القراء ص ۶۰۶)

یعنی حضرت ابو الدرداءؓ جب صبح کی نماز سے فارغ ہوتے تو دس دس آدمیوں کی جدا جدا جماعت قائم کرتے۔ ایک بار تمام طلبہ کو شمار کرانے پر معلوم ہوا کہ بیک وقت ایک ہزار چھ سو سے زائد طلبہ تھے۔

ان معلمین نے خود تعلیم دینے کے بعد اپنے قائم مقاموں کو مقرر کرنے کا سلسلہ جاری کیا، چنانچہ اپنے شاگردوں میں سے چند ممتاز لوگوں کو معلمی کی خدمت پر مامور کر دیتے تھے جو نہایت توجہ سے اپنے فرض کو انجام دیتے تھے۔ پھر ان شاگردوں نے اپنے شاگردوں میں سے مستحق طلبا کو اپنا قائم مقام بنایا۔ اس طرح یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ چلتا رہا جو اب تک جاری ہے، اس طریقہ سے بے شمار اشخاص کے ذریعہ سے جو مختلف نسلوں اور مختلف زمانوں کے سیکڑوں برس کے اندر دنیا کے دور دراز مقامات میں گزرے ہیں، قرآن مجید کی روایت ہوتی چلی آتی ہے اور اسی کا نام تواتر ہے۔

قرآن مجید کے جو نسخے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے املا اور ترتیب پر تیار ہوئے تھے وہ تحریری اور زبانی قرأت دونوں میں باہم مطابق تھے۔ اس لئے کہ دونوں کاموں میں خود رسول اللہ کا دست مبارک شامل تھا اور زبانی قرأت میں اکثر تحریری نسخوں کے ساتھ مقابلہ ضروری تھا، بالخصوص ایسے مواقع پر جہاں تشابہ لگ جائے۔ ان میں اختلاف نہ ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وعدۂ الٰہی ہے:

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔

یعنی ہم ہی نے قرآن اتارا، اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

اگر اختلاف ہو گیا تو پھر حفاظت کیا ہوئی۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ اس کی اہمیت سے پوری طرح واقف تھے، کہ قرآن مجید کے ہر معاملہ میں توافق اور تطابق ضروری ہے اور خود قرآن مجید نے ان کو بتلایا تھا:

لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا۔

یعنی اگر قرآن مجید غیر خدا کی جانب سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے۔

اس لئے جب خدا کی جانب سے اختلاف غیر ممکن تھا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ انسانوں کی جانب سے اس میں اختلاف پیدا کر دیا جاتا۔

۲۔ عہد نبوی کی ترتیب اور موجودہ مصحف کی ترتیب میں مطابقت کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت جبرئیلؑ رسول اللہ صلعم کے ساتھ رمضان میں قرآن مجید کا دور کیا کرتے تھے، اس دورے میں اس وقت تک کی نازل شدہ وحی کی تکرار ترتیب کے ساتھ ہوا کرتی تھی، چنانچہ جس سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی، اس سال قرآن مجید کا دور دوبار ہوا، دور اول کا واقعہ صحیح بخاری جلد سوم ص ۱۴۱ میں مذکور ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ دورہ غیر مرتب صورت میں نہیں ہو سکتا، اس کے لئے ترتیب آیات اور ترتیب سور ضروری ہے، جو بتوفیق الٰہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی، اسی ترتیب کے ساتھ آپ نے قرآن مجید امت کو اشاعت کے لئے دیا، اس لئے یہ ہرگز بھی خیال نہیں کیا جا سکتا کہ اس ترتیب میں جو توقیف الٰہی ہو چکی تھی کوئی تغیر و تبدل کیا جا سکتا تھا، اس قسم کی روایتیں موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی شخص بھی اس ترتیب میں تغیر کی جرأت نہیں کر سکتا تھا مثلاً

(الف) تذکرۃ الحفاظ میں ہے:

ان الحجاج خطب فقال ان ابن الزبیر بدل کلام اللہ فقام ابن عمر فقال کذب لم یکن ابن الزبیر یستطیع ان یبدل کلام اللہ ولا انت (جلد اول ص ۳۷)

یعنی حجاج نے خطبہ دیا اور کہا کہ ابن زبیر نے کلام خدا کو بدل دیا، اس پر ابن عمرؓ کھڑے ہوئے اور کہا کہ جھوٹ ہے، نہ ابن زبیر کو یہ طاقت تھی کہ وہ کلام اللہ کو بدل سکتے، اور نہ تجھ کو یہ مقدور ہے۔

(ب) صحیح بخاری میں ہے:۔

قال ابن الزبیر لعثمان ابن عفان والذین یتوفون الخ قال قد نسختھا الایۃ الاخری فلم تکتبھا او تدعھا قال یا ابن اختی لا اغیر شیئاً منہ من مکانہ۔ (صحیح بخاری ج ۳ ص ۶۷)

یعنی ابن زبیرؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ آیت والذین یتوفون منکم الخ ایک دوسری آیت سے منسوخ ہو چکی ہے تو آپ اس آیت کو نہ لکھئے، یا یہ کہا کہ اس کو چھوڑ دو۔ اس پر عثمانؓ نے کہا کہ اے میرے بھتیجے میں قرآن کی کسی چیز کو اس کی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا۔

الغرض جو قرآن اس وقت ہمارے ہاتھوں میں بذریعہ تواتر موجود ہے، وہ یقیناً اسی ترتیب کے مطابق ہے جس پر حضرت جبرئیلؑ کا دورہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے ساتھ سالانہ ہوا کرتا تھا۔

۳۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلاوت کو ہفتہ پر اس طرح تقسیم کر دیا تھا کہ ہر روز کے لئے ایک مقدار معین فرمالی تھی، اس مقدار کا نام حزب ہے، حزب کی جو تفصیل حدیث میں آئی ہے وہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب سور عہد نبوی میں بالکل وہی تھی جو آج ہے، اس کی شہادت کیلئے احادیث ذیل ملاحظہ ہوں:

(الف) عن اوس ابن حذیفۃ الثقفی قال کنت فی الوفدین الذین اسلموا من ثقیف۔۔۔۔ فقال لنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طرأ علی حزبی من القرآن فاردت ان لا اخرج حتی اقضیہ فسئالنا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقلنا کیف تحزبون القرآن قالوا نحزبہ ثلث سور وخمس سور و تسع سور و احدی عشرۃ سورۃ وثلث عشرۃ سورۃ وحزب المفصل من ق حتی یختم (مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۳۴۳)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا معمول قرآن مجید آج پڑھنے سے رہ گیا تھا، تو میں نے یہ ارادہ کیا کہ جب اس مقدار معین کو ادا کر لوں اس وقت باہر نکلوں۔ . . . . . اس بات پر ہم نے صحابہ سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے قرآن کا حزب کس طریقہ سے مقرر کیا ہے، انھوں نے جواب دیا کہ پہلا حزب تین سورتوں کا، دوسرا پانچ سورتوں کا، تیسرا نو سورتوں کا چوتھا گیارہ سورتوں کا۔ پانچواں تیرہ سورتوں کا اور چھٹا آخری مفصل کا جو سورۂ ق سے ختم قرآن تک ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو ترتیب سُوَر اس وقت ہے وہی اس وقت بھی تھی۔

(ب) عن واثلۃ ابن الاسقع قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعطیت مکان التوراۃ السبع الطوال واعطیت مکان الزبور المئین واعطیت مکان الانجیل المثانی وفضلت بالمفصل (مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۱۰۷)

یعنی مجھ کو توریت کے بدلہ میں قرآن کی سات بڑی سورتیں عطا ہوئی ہیں اور زبور کے بدلے میں سو آیتوں والی سورتیں، اور انجیل کے بدلہ میں سورۂ فاتحہ اور مجھ کو مفصل سورتیں عطا فرما کر فضیلت دی گئی ہے۔

عہد نبوی کی ترتیب سے موجودہ قرآن کی ترتیب کی مطابقت کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اکابر علمائے اسلام جو مختلف قوموں، فرقوں اور زمانوں میں گزرے ہیں شروع سے آخر تک اس بات کے قائل رہے ہیں کہ قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جمع ہو چکا تھا اور اس کی آیتیں اور سورتیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب فرمائی تھیں اور پھر اسی ترتیب کے ساتھ وہی مجموعہ بذریعہ تواتر مسلمانوں میں برابر چلا آرہا ہے، ان میں سے بعض علماء کی رائیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱— امام مالک (متوفی ۱۷۹ھ) سے جو قدیم ترین علماء میں ہیں، اتقان میں منقول ہے۔

عن ابی وھب سمعت مالکا یقول انما الف القرآن علی ما کانوا سمعوا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم (اتقان ص ۱۴۲)

یعنی قرآن کی تالیف اسی طریقہ پر ہوئی ہے جس طریقہ پر صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔

۲— امام بغوی (متوفی ۵۱۰ھ) کا یہ قول بھی اتقان میں ہے۔ [1]

یعنی امام بغوی نے اپنی کتاب شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ صحابہؓ نے دو پٹھوں کے اندر اسی قرآن کو لکھا جس کو اللہ نے اپنے رسول پر نازل فرمایا، جیسا انھوں نے سنا ویسا ہی لکھ لیا۔ نہ اس میں کسی چیز کو آگے رکھا، اور نہ کسی چیز کو پیچھے کیا، اور نہ کوئی ایسی ترتیب دی کہ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل نہ کیا ہو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو قرآن اسی ترتیب پر تلقین کر دیتے تھے جو اس وقت ہمارے نسخوں میں ہے، اور یہ اس طور پر تھا کہ جبریل بوقتِ نزول آپ کو

[1] آئندہ صفحات میں بغرض اختصار، عربی کی عبارت حذف کر دی گئی ہیں اور صرف ان کا ترجمہ ہی نقل کیا گیا ہے۔ (طلوع اسلام)

بتلا دیتے تھے کہ یہ آیت فلاں آیت کے بعد فلاں سورہ میں لکھی جائے۔ (اتقان ص ۱۴۴، ۱۴۵)

۳۔ ابن الحصار فرماتے ہیں:۔

کہ سورتوں کی ترتیب اور آیتوں کی جگہیں وحی کے ذریعہ سے معلوم ہوئی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیا کرتے تھے کہ فلاں آیت فلاں جگہ پر لکھو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت اور صحابہ کے اجماع سے جو نقل متواتر ہے، یہ بات بالکل یقینی ہے۔ (اتقان ص ۱۴۵)

۴۔ ابوبکر ابن الانباری (متوفی ۳۲۸ھ) کا بیان ہے:

کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن سارے کا سارا سماء دنیا پر نازل فرمادیا[1] پھر بیس سال سے کچھ زیادہ میں اس کو بانٹ دیا۔ چنانچہ سورۃ کسی پیش آمدہ واقعہ کے لئے اور آیت سائل کے سوال کے جواب میں اترتی تھیں۔ تو جبریل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آیت اور سورۃ کی جگہ بتلا دیتے تھے، اس لئے سورتوں کی ترتیب بھی مثل آیتوں کی ترتیب کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرتب کردہ ہے، اور اگر کوئی شخص کسی سورۃ کو مقدم یا موخر کریگا تو وہ نظم قرآنی کو بگاڑ دیگا۔ (اتقان ص ۱۴۵، ۱۴۶)

۵۔ برہان الدین ابو القاسم محمود بن حمزہ ابن نصر الکرمانی المقری الشافعی (صاحب کتاب البرہان فی توجیہ متشابہ القرآن) (متوفی بعد ۵۰۵ھ) کذا فی الکشف فرماتے ہیں:۔

کہ سورتوں کی ترتیب اسی طرح اللہ تعالیٰ کے یہاں لوح محفوظ میں ہے اور اسی ترتیب کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال جبرئیل سے جمع شدہ قرآن کا دورہ کرتے تھے، جو آپ پر اس وقت تک نازل ہو چکا ہوتا تھا۔ سالِ وفات میں دو بار حضرت جبرئیلؑ کے ساتھ دورہ ہوا۔ (اتقان ص ۱۴۶)

۶۔ طیبی (متوفی ۷۴۳ھ) فرماتے ہیں کہ

قرآن پہلے مجموعی طور پر لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نازل ہوا، پھر ضرورت کے مطابق نازل ہوتا رہا پھر اسی ترتیب کے مطابق جو لوحِ محفوظ میں ہے مصاحف میں لکھا گیا۔ (اتقان ص ۱۴۶)

۷۔ احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی (متوفی ۷۰۸ھ) فرماتے ہیں کہ

یعنی ابو جعفر ابن زبیر کہتے ہیں کہ بہت سی حدیثیں ترتیب کی شہادت دیتی ہیں، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو چمکتی ہوئی سورتیں بقرہ اور آلِ عمران پڑھا کرو، اس کو مسلم نے روایت کیا۔ اسی طرح سعید ابن خالد کی یہ حدیث کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات بڑی بڑی سورتیں ایک رکعت میں پڑھیں، اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں روایت کیا ہے۔ اسی کتاب میں ایک اور بھی حدیث ہے کہ آنحضرت مفصل سورتوں کو ایک ہی رکعت میں پڑھ ڈالتے تھے۔ بخاری نے ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل اور کہف اور مریم اور طٰہٰ اور انبیاء

---

[1] قرآن میں اس کی کوئی سند نہیں۔ (طلوع اسلام)

یہ سب کی سب اعلیٰ درجے کی سورتیں ہیں اور یہ میرا مال موروثی ہیں، اس طرح ان سورتوں کا ذکر اسی ترتیب سے فرمایا جس ترتیب کے ساتھ آج وہ ہیں۔ بخاری میں یہ بھی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات کو جب اپنے بستر پر تشریف لیجاتے تھے تو اپنی ہتھیلیوں کو ملا کر، قل ہو اللہ اور معوذتین پڑھ کر پھونکتے تھے۔ (اتقان ص ۱۴۷)

۸- ابو جعفر النحاس (متوفی ۳۳۸ھ) فرماتے ہیں:-

کہ صحیح بات یہی ہے کہ سورتوں کی یہی ترتیب رسول اللہؐ کی دی ہوئی ہے، جیسا کہ حدیث واثلہ سے معلوم ہوتا ہے، (یہ حدیث پہلے ذکر کی جا چکی ہے) یہ حدیث صاف بتلاتی ہے کہ قرآن کی ترتیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوئی تھی اور وہ اسی وقت کی ہے اور اس وقت کا قرآن اسی ترتیب پر ہے، اس لئے کہ یہ حدیث ترتیب قرآن کے متعلق خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں ہے، ابو جعفر یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن کی ترتیب توقیفی ہونے پر اوس ابن ابی اوس کی روایت بھی دلالت کرتی ہے، (یہ روایت بھی اوپر گزر چکی ہے)۔ علامہ سیوطی کہتے ہیں کہ میرے نزدیک سورتوں کی ترتیب توقیفی ہونے پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حٰمٓ سے شروع ہونے والی سورتیں مرتب لائی گئی ہیں اور اسی طرح طٰس والی بھی، لیکن یسبح یا سبح سے شروع ہونے والی سورتیں ترتیب وار نہیں ہیں، بلکہ ان کے اندر فصل واقع ہے، اسی طرح طٰسٓمٓ، سورۂ شعراء و طٰسٓمٓ سورۂ قصص کے بیچ میں طٰس ہے، حالانکہ وہ ان دونوں سے چھوٹی ہے، اس لئے اگر ترتیب اجتہادی ہوتی، تو مسبحات ترتیب وار لائی جاتیں اور طٰس سورۂ قصص سے پیچھے لائی جاتی۔ (بحوالہ اتقان ص ۱۴۷، ۱۴۸)

۹- ابن حزم (متوفی ۴۵۶ھ) کا بیان ہے:

یعنی جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ آیاتِ قرآنی اور اس کی سورتوں کی ترتیب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، اور نہ اس کے رسول کے حکم سے، ایسا شخص جاہل اور بہتان باندھنے والا ہے، کیا اس شخص نے یہ آیت نہیں سنی (جو آیت بھی ہم منسوخ کرتے ہیں، یا بھلا دیتے ہیں، اس کے عوض اس سے بہتر یا اس جیسی لا دیتے ہیں[1]) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیۃ الکرسی اور آیۃ الکلالہ کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ اس کے علم میں نہیں ہے، حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو فرماتے یہ آیت فلاں سورت میں فلاں جگہ لکھدی جائے۔ اگر لوگوں نے قرآن کو ترتیب دیا ہوتا تو وہ اس کے تین ہی طریقے اختیار کرتے، یا بترتیب نزول مرتب کرتے، یا پہلے بڑی سورتیں رکھتے اس کے بعد چھوٹی، یا پہلے چھوٹی رکھتے اس کے بعد بڑی لیکن جب یہ صورت نہیں ہے تو یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حکم سے مرتب ہونا ثابت ہے، اور یہ چیز خدا کی جانب سے ہونے کے معارض نہیں ہے، اس کے علاوہ اور کوئی بات ہرگز صحیح نہیں ہے۔ (کتاب الفصل ج ۴ ص ۲۲۱)

یہی ابن حزم قرآن مجید کے نسخوں کے متعلق رقمطراز ہیں:

یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا، تو اسلام سارے جزیرۂ عرب میں پھیل چکا تھا، بحر قلزم سے لیکر ساحل یمن تک

---

[1] قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں، ناسخ و منسوخ کا عقیدہ عجمی سازش کا تراشیدہ ہے۔ (طلوع اسلام)

اور بحر فارس سے فرات تک اور اس جزیرہ میں بے شمار شہر اور گاؤں بسے ہوئے تھے، مثلاً یمن، بحرین، وغیرہ جہاں کے تمام باشندے اسلام لا چکے تھے جنھوں نے مسجدیں بنائی تھیں، اور کوئی شہر کوئی گاؤں، کوئی محلہ ایسا نہ تھا جہاں نمازوں میں قرآن نہ پڑھا جاتا ہو، بچے مرد اور عورتیں سب ہی اس کو حاصل کرتے تھے اور وہ لکھا بھی جاتا تھا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ ڈھائی برس خلیفہ رہے انھوں نے فارس و یمن پر حملے کئے، یمامہ فتح کیا اور قرآن کی قرأۃ لوگوں میں زیادہ پھیلی، کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں قرآن کے نسخے نہ ہوں، حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں ایران کے طول و عرض اور پورے شام و مصر کو فتح کیا، ان ملکوں میں بھی کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں مسجدیں نہ بنی ہوں اور قرآن مجید کے نسخے نہ لکھے گئے ہوں، مساجد کے امام قرآن پڑھتے تھے، لڑکے مکتبوں میں مشرق سے غرب تک قرآن حاصل کرتے تھے، یہ حالت دس برس اور چند ماہ رہی اور جس وقت حضرت عمرؓ کا انتقال ہوا ہے، اس وقت مصر سے لیکر عراق و شام و یمن وغیرہ میں کم سے کم ایک لاکھ نسخے رہے ہونگے (کتاب الفصل ج۲ ص۶۷)

۱۰- ملا عبد العلی بحر العلوم شرح مسلّم الثبوت میں لکھتے ہیں:

اہل حق کا اس بات پر اجماع ہے کہ ہر سورۃ کی آیتوں کی ترتیب خدا اور رسول کے حکم کے مطابق ہے، اور محققین کا مذہب یہ ہے کہ سورتوں کی ترتیب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ہے۔ (کتاب مذکور جلد ۳ ص ۱۱ و ۳۱)

۱۱- مولوی سید محمد صاحب مجتہد شیعی تنزیہ الفرقان میں مولوی سید مرتضیٰ علم الہدیٰ سے نقل کرتے ہیں۔

یعنی قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسی طرح مرتب اور لکھا ہوا تھا جیسا کہ وہ آج ہے (ملاحظہ ہو تاریخ القرآن مولفہ مفتی عبد اللطیف صاحب ص ۱۰۱ مطبوعہ رحمانیہ مونگیر)

۱۲- محمد بن الحسن حر عاملی شیعی لکھتے ہیں:

یعنی جس کسی نے بھی تاریخ و احادیث پر غور کیا ہے وہ یقیناً جانتا ہے کہ قرآن تواتر کے اعلیٰ درجہ پر ہے، ہزاروں صحابی اس کو یاد بھی کرتے تھے اور دوسروں تک پہنچاتے بھی تھے، اور یہ کہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مرتب طور پر لکھا ہوا تھا۔ (تاریخ القرآن ص ۱۰۴)

غرض عہد نبوی میں قرآن مجید کی سورتوں اور آیات کی ترتیب اور اس کی کتابی تدوین ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے کہ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے، لیکن تین روایتیں ایسی ملتی ہیں جن سے اس بارہ میں شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے آئندہ سطور میں اس پر بحث کر کے ان کی حقیقت ظاہر کی جائے گی۔ [1]

پہلی روایت ابن شہاب زہری سے مروی ہے، جو صحیح بخاری میں تین جگہ آئی ہے، تفسیر سورۂ توبہ میں فضائل قرآن کے باب جمع القرآن میں اور کتاب الاحکام کے باب یستحب للکاتب ان یکون امیناً عاقلاً میں صحیح بخاری کے علاوہ جامع ترمذی تفسیر سورۂ توبہ میں بھی یہ روایت ہے، لیکن صحیح بخاری کی تینوں روایتیں اور ترمذی کی روایت سب کی سب ابن شہاب زہری عن عبید بن السباق سے مروی ہیں بخاری کی سند میں زہری تک دو واسطے ہیں، پہلی عن ابی الیمان عن شعیب، دوسری عن موسیٰ بن اسمٰعیل عن ابراہیم ابن سعد، تیسری

[1] ان روایات کے متعلق علامہ تمنا عمادی کا مفصل مقالہ طلوع اسلام بابت اگست و ستمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ (طلوع اسلام)

عن محمد بن عبید اللہ ابی ثابت عن ابراہیم بن سعد۔ ترمذی کی روایت میں زہری تک تین واسطے ہیں۔ عن محمد ابن بشار عن عبد الرحمٰن بن مہدی عن ابراہیم بن سعد۔ غرض تمام طرق کا مدار زہری پر ہے جو عبید بن السباق سے اس کو روایت کرتے ہیں، محدثین نے کسی روایت کو جانچنے کے دو قاعدے مقرر کئے ہیں، پہلا باعتبار سند، دوسرا باعتبار روایت و عقل، اس لئے ان روایتوں کا متن[1] نقل کر کے انہی کے قواعد کی روشنی میں ان پر بحث کی جائے گی۔ روایت یہ ہے:

یعنی زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ یمامہ میں قتل کے واقعہ کے بعد مجھ کو حضرت ابوبکرؓ نے بلا بھیجا حضرت عمرؓ بھی ان کے پاس تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے فرمایا کہ عمرؓ نے آکر مجھ سے کہا کہ یمامہ میں قرآن کے قاری بہت قتل ہو گئے ہیں، اگر لڑائیوں میں قرآن کے قاری اسی طرح زیادہ قتل ہوتے رہے تو بہت سا قرآن ضائع ہو جائے گا، اس لئے میری رائے ہے کہ آپ قرآن جمع کرنے کا حکم دیں، حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا: میں کیسے وہ کام کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا ہے۔ عمرؓ نے جواب دیا خدا کی قسم یہ اچھی بات ہے۔ عمرؓ مجھ سے اس بارے میں برابر گفتگو کرتے رہے یہاں تک کہ خدا نے میرا سینہ بھی اس رائے کے لئے کھول دیا جس کے لئے عمرؓ کا سینہ کھولا تھا اور عمرؓ کی طرح میری سمجھ میں بھی یہ بات آگئی۔ زید کہتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے مجھ سے کہا کہ تم جوان عقلمند ہو اور تمہارا دامن بھی اتہام سے پاک ہے، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی بھی تھے اسلئے قرآن تلاش کر کے جمع کرو۔ زید کہتے ہیں کہ خدا کی قسم اگر کسی پہاڑ کو ہٹانے پر بھی وہ مامور کرتے تو مجھ پر اتنا گراں نہ گذرتا، جتنا قرآن کا جمع کرنا میرے لئے گراں تھا، میں نے کہا آپ دونوں ایسا کام کس طرح کرنا چاہتے ہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا خدا کی قسم یہ بات اچھی ہے اور برابر مجھ سے اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ نے میرا سینہ بھی اس رائے کیلئے کھول دیا جس کے لئے ابوبکرؓ و عمرؓ کا سینہ کھولا تھا اور میں نے بھی وہی سمجھ لیا جو انھوں نے سمجھا تھا، چنانچہ میں نے کھجور کی چھالوں، چمڑے کے ٹکڑوں، پتھروں نیز اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کی تلاش شروع کر دی تو سورۂ توبہ کی آخری آیتیں خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس ملیں۔ (صحیح بخاری جلد چہارم ص ۱۴۹، ۱۵۰)

صحیح بخاری کی اس روایت میں جو تین جدا جدا مقامات پر آئی ہے، الفاظ کے اندر اختلاف پایا جاتا ہے جس کو اصطلاحِ محدثین میں اضطراب کہتے ہیں، اضطراب کی وجہ سے حدیث کی قوت کم ہو جاتی ہے، وہ اختلاف یہ ہے:-

بخاری کی روایت ابراہیم سے	بخاری کی روایت شعیب سے	ترمذی کی روایت
(۱) قد استحر یوم الیمامۃ بقراء القرآن	(۱) قد استحر یوم الیمامۃ بالناس	(۱) قد استحر بقراء القرآن یوم الیمامۃ
(۲) من العسب والرقاع واللخاف وصدور الرجال	(۲) من الرقاع والاکتاف والعسب و صدور الرجال	(۲) من الرقاع والعسب واللخاف وصدور الرجال
(۳) فوجدت آخر سورۃ التوبۃ مع خزیمۃ او ابی خزیمۃ۔	(۳) حتی وجدت من سورۃ التوبۃ ایتین مع خزیمۃ الانصاری	(۳) مع خزیمۃ بن ثابت،
(۴) فالحقتھا فی سورتھا	(۴) شعیب کی روایت میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔	(۴) ترمذی میں بھی یہ الفاظ نہیں ہیں۔

[1] متن حذف کر دیا گیا ہے۔ اہل طلب اصل کتاب (بخاری) سے دیکھ لیں۔ (طلوع اسلام)

یہ اضطراب متن کا ہے، سند میں دیکھا جائے تو حسب ذیل امور قابل بحث ہیں :-

(۱) زہری کے متعلق میزان الاعتدال جلد سوم ص ۱۲۶ میں ہے[1]:-

کبھی کبھی وہ تدلیس کر جاتے تھے۔

یعنی کسی معاصر سے بغیر سنے ہوئے اس طور پر روایت کرنا کہ سنا ہوا ہونا معلوم ہو یا سُنی ہوئی بات اس طرح بیان کرنا کہ اسناد کی شناخت نہ ہو سکے

اور تہذیب التہذیب جلد نہم ص ۴۴۷ پر ہے :-

یعنی دو سو حدیثیں زہری کی غیر ثقہ لوگوں سے مروی ہیں اور وہ حدیثیں جن میں محدثین نے اختلاف کیا ہے پوری پچاس نہ ہوں گی،

اور اختلاف کے معنی ہمارے نزدیک یہ ہیں کہ جس کو کسی جماعت نے منفرد ہو کر روایت کیا ہو۔

(۲) زہری کی عادت ادراج کی تھی، یعنی حدیث میں اپنی طرف سے الفاظ بڑھا دینے کی بھی تھی، چنانچہ آغازِ وحی والی حدیث میں "تحنث" کے بعد "وھو التعبد" ان کا ادراج ہے۔ (ملاحظہ ہو فتح الباری جلد اول ص ۱۲، اور تدریب الراوی ص ۹۹) توجیہ النظر ص ۱۷۲ پر ہے :

یعنی ادراج کی تمام قسمیں منع ہیں، سمعانی کہتے ہیں جو شخص قصداً ادراج کرے، اس کی عدالت ساقط ہو جاتی ہے لیکن بعض لوگوں نے اس

ادراج کو مستثنیٰ کیا ہے جو کسی نادر لفظ کی تشریح کے لئے ہو، اور ایسا ادراج زہری نے کیا ہے۔

(۳) زہری اس روایت میں منفرد ہیں، کیونکہ اور کسی نے اس واقعہ کو روایت نہیں کیا ہے، تفرد بھی ضعف کا موجب ہے اور زہری کی اس روایت میں ادراج اور تدلیس اور تفرد یہ سب باتیں موجود ہیں جس سے یہ روایت پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔

(۴) دوسرے راوی ابراہیم بن سعد کی بابت میزان الاعتدال جلد اول ص ۷ پر ہے :-

یعنی یحییٰ بن سعید کے سامنے عقیل اور ابراہیم کا ذکر ہوا تو انھوں نے ان دونوں کو ضعیف بتلایا

۵ - عبید بن السباق جو اس واقعہ کو زید بن ثابتؓ سے روایت کرتے ہیں، ان کے نہ سنہ ولادت کا پتہ ہے اور نہ سنہ وفات کا۔ تہذیب التہذیب جو اسماء الرجال کی سب سے بڑی کتاب ہے، اس میں ان کا ذکر صرف چند سطروں میں ہے اور وہ بھی اس طور پر کہ جن لوگوں سے انھوں نے روایت کی، اور جن لوگوں نے ان سے روایت کی ان کے نام لکھ دیئے ہیں، خود ان کی ذات کے متعلق صرف دو کلمے ہیں :-

الثقفی المدنی یعنی قبیلۂ ثقیف کے اور مدینے کے رہنے والے ہیں۔

(۶) - سورۂ توبہ کی آخری آیتوں کا خزیمہ یا ابوخزیمہ سے ملنے کا بیان بھی شک کے ساتھ ہے، کیونکہ یہ دونوں الگ الگ ہیں، اور شک موجبِ ضعف ہے، یہ تو اس روایت کی روایتی حیثیت ہے، درایتی حیثیت یہ ہے کہ

۱ - تفرد اور خبر احاد ہونے کی وجہ سے تواتر کے مقابلہ میں ناقابلِ قبول ہے، کیونکہ تواتر سے یہ ثابت ہے کہ عہد نبوی ہی سے پورا قرآن مرتب ہو کر بذریعہ تواتر نقل ہوتا چلا آ رہا ہے، اس لئے اس تواتر کے مقابلہ میں یہ روایت اگر قوی بھی ہوتی تو بھی معتبر نہیں ہو سکتی تھی، نہ کہ اس میں مذکورہ بالا کمزوریاں بھی موجود ہیں، اس حالت میں مقابلہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

---

[1] زہری کے متعلق تفصیلی مقالہ (از علامہ تمنا عمادی) طلوع اسلام بابت ستمبر ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ (طلوع اسلام)

۲- یہ روایت خود زہری کی بخاری کی اس روایت کے خلاف ہے کہ زید بن ثابتؓ نے عہد نبویؐ میں قرآن جمع کیا تھا۔

۳- اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی متفرق آیتیں پتھر کے ٹکڑوں، پتوں، اور کھجور کی چھال پر لکھی ہوئی تھیں جن کی حفاظت بحیثیت مجموعی غیر ممکن ہے اور عقل اس کو ہرگز باور نہیں کر سکتی کہ قرآن جیسی اہم چیز اس طرح پراگندہ پڑی رہی ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کچھ خیال نہ فرمایا ہو، یہ چیز بلغ ما انزل الیک کے بھی خلاف ہے کیونکہ تبلیغ کامل کی صورت صرف یہی ہے کہ کلام مجید کو مرتب اور محفوظ صورت میں لوگوں تک پہنچایا جائے تاکہ کسی خلل کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ پتوں وغیرہ پر لکھے ہونے کی حالت میں ترتیب سور کا یا ذکر، ترتیب آیات بھی قائم نہیں رہ سکتی تھی، حالانکہ عہد نبویؐ میں آیات کی ترتیب روز روشن کی طرح ثابت ہو چکی ہے، تیسری بات یہ ہے کہ عہد نبوی میں قرآن کی تعلیم کا مکمل انتظام ہونا ثابت ہے اور پراگندہ حالت میں جبکہ پتھر کے ٹکڑوں اور پتوں پر وہ لکھا ہوا تھا، اس کی تعلیم کس طرح ممکن ہوتی۔

۴- حضرت ابوبکرؓ ربیع الاول ۱۱ھ میں خلیفہ ہوئے، آپ کی مدت خلافت دو برس تین ماہ گیارہ یوم ہے۔ جنگِ یمامہ ۱۲ھ کے آخر میں ہوئی ہے۔ اگر زید بن ثابتؓ نے اس جنگ کے بعد قرآن کو جمع کیا اور جیسا کہ اس روایت سے ثابت ہے حضرت ابوبکرؓ ہی کے زمانہ میں اس کو مکمل بھی کر لیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تقریباً ڈیڑھ سال میں انھوں نے تنہا یہ عظیم الشان کام پورا کر لیا۔ جو بالکل خلافِ عقل ہے کہ تنہا ایک شخص اتنے بڑے کام کو جو کوہ کندن اور کاہ برآوردن سے بھی زیادہ سخت ہے اتنی تھوڑی سی مدت میں مکمل کر لے، اس کام کی دشواری کا بیان خود روایت میں بھی موجود ہے۔

۵- عقل اس کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایسے اہم اور مشکل کام کو تنہا ایک شخص کی سپردگی میں دیا ہوگا، جب کہ قرآن سے شغف رکھنے والے اور بہت سے صحابہؓ بلکہ ان سے بہتر زندہ موجود تھے۔ مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ، اور ابو الدرداء وغیرہما جن کے اسماء اوپر تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکے ہیں، بلکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کام حفاظ اور کتاب صحابہ کی پوری جماعت کے سپرد کیا جاتا، جیسا کہ حضرت عثمانؓ نے اس سے کہیں کم اہم نقلِ مصاحف کا کام ایک جماعت کے سپرد کیا تھا۔

۶- اس روایت کا یہ بیان بھی کہ جنگِ یمامہ میں بکثرت قاری شہید ہوئے، واقعہ کے خلاف ہے۔ یوں تو اس زمانہ کا ہر مسلمان قاری و حافظ تھا، اسلئے جتنے بھی مسلمان شہید ہوئے، سب قاری و حافظ رہے ہوں گے لیکن یہ لوگ اس پایہ کے نہ تھے کہ ان کی شہادت سے قرآن کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو سکتا، ایسے قراء و حفاظ جن کا خاص مشغلہ قرآن تھا اور جن کی شہادت سے قرآن کے ضائع جانے کا اندیشہ ہو سکتا تھا ان میں کم تھے۔ مشہور قراء میں سے صرف سالم مولیٰ ابوحذیفہ اس جنگ میں شہید ہوئے، اس لئے قرآن مجید کی جمع و ترتیب کا سبب قراء کی شہادت کو قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے۔

۷- قرآن مجید کی اہمیت اس کی متقاضی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اس کی جمع و ترتیب کا کام انجام دیتے[1] جیسا کہ اوپر ثابت ہو چکا ہے، لیکن اگر بفرض محال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کو نہیں کیا تھا تو آپ کی وفات کے بعد صحابہؓ

---

[1] یہ ٹکڑا بڑا اہم ہے۔ اس کے متعلق مضمون کے آخر میں استدراک ملاحظہ کیجئے۔ (طلوع اسلام)۔

اور خلفاء کا اولین فرض یہ تھا کہ وہ بلا لحاظ اس کے کہ کسی جنگ میں قرار شہید ہوئے ہوں یا نہ شہید ہوئے ہوں، قرآن کی جمع و ترتیب کا فرض انجام دیتے، کیونکہ قرار کی شہادت اگر نہ بھی ہوتی تو بھی موت سے کس کو مفر ہے، ایسی حالت میں صرف حفاظِ قرآن کی موت ہی کے اندیشہ سے یہ فرض تھا کہ صحابہ اس کو جمع و مرتب کر کے اس کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ میں بھیجدیتے جس طرح حفاظِ قرآن کو خلفا نے جا بجا بھیجا تھا۔

۸۔ جمع و ترتیب قرآن کے بارہ میں اگر حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور زید بن ثابتؓ کی یہ رد و کد صحیح مان لی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن مجید کی جمع و ترتیب سے بے خبر تھے حالانکہ خود صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ متعدد صحابہؓ نے عہد نبوی میں قرآن جمع کر لیا تھا اور عقل اس کو باور نہیں کر سکتی کہ قرآن جمع ہو گیا ہوتا اور یہ حضرات بے خبر رہتے۔

۹۔ سورۂ براءۃ کی آخری آیتوں کا صرف خزیمہ یا ابوخزیمہ کے پاس ملنا خود صحیح بخاری کی اس روایت کے خلاف ہے کہ

عن البراء قال آخر سورة نزلت كاملة براءة (بخاری ج ۲ صفحہ ۲۹ و ج ۳ ۸۴)

یعنی قرآن کی آخری سورہ جو مکمل نازل ہوئی، سورہ براءۃ ہے۔

اور جب یہ سورہ پوری نازل ہوئی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی آخری آیتیں گم ہو گئی ہوں اور محض ایک شخص کے پاس ملی ہوں، اور تاریخی شہادت سے بھی ثابت ہے کہ حضرت علیؓ نے حجاج کے مجمع میں پوری سورۂ براءۃ پڑھکر سنائی تھی (دیکھئے صحیح بخاری ج ۳ ص ۸۴، ۸۵)

اب اس سلسلہ کی دوسری روایت کو جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ترتیب سور میں صحابہ کا ہاتھ تھا بہ نظر نقد دیکھنا چاہتے۔ یہ روایت ترمذی (جلد ۲ ص ۱۴۳) میں ہے:-

یعنی حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ آپ نے سورۂ انفال کو جو مثانی سے ہے اور سورۂ براءۃ کو جو مئین سے ہے کیوں ملا دیا اور دونوں کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی اور اس کو سات بڑی سورتوں میں لے لیا۔ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ سورۂ انفال مدینہ میں پہلے نازل ہونے والی سورتوں میں ہے اور براءۃ آخر میں نازل ہوئی اور دونوں کا مضمون ملتا جلتا ہے اسلئے میں نے یہ خیال کیا کہ دونوں ایک ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا اور آپ نے یہ نہیں بتلایا کہ براءۃ انفال کا جزء ہے، اس لئے میں نے دونوں کو ملا دیا اور بسم اللہ نہیں لکھی اور اس کو سات بڑی سورتوں میں لے لیا۔

اس روایت میں اگرچہ اس کی تصریح نہیں ہے کہ سورتوں کی ترتیب صحابہؓ نے دی، مگر انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل صحابہ کا ہے جب ہی حضرت عثمانؓ نے سورۂ انفال اور براءۃ کو ملا دیا۔

اس روایت کی تنقید بھی سند اور درایت دونوں کے اعتبار سے ضروری ہے، سند کے اعتبار سے [illegible] خرابی ہے کہ تمام طرق عوف ابن ابی جمیلہ سے چلتے ہیں۔ عوف کے علاوہ کسی اور راوی نے اس کو روایت نہیں کیا اور اس کا یہ حال ہے کہ ابن مبارک نے اس کو قدری شیعی کہا ہے (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب جلد ہشتم ص ۱۶۷) پھر اسی کتاب میں اسی صفحہ پر میزان الاعتدال کے حوالہ سے اسکو رافضی

لکھا ہے۔ ایک اور خرابی اس روایت میں یہ ہے کہ یزید الفارسی مجہول شخص ہے، چنانچہ تہذیب التہذیب جلد یازدہم ص ۳۶۷ میں ہے کہ

یعنی یحییٰ بن سعید جیسا فنِ رجال کا ماہر شخص اس یزید فارسی کو نہیں جانتا۔

درایت کے اعتبار سے حسب ذیل امور اس روایت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں، پہلی تو یہی بات ہے کہ سورتوں کی ترتیب بھی بذریعہ تواتر آنحضرتؐ سے ثابت ہے اور یہ روایت اس کے خلاف ہے دوسرے یہ کہ قرآن مجید جس کی حفاظت کا وعدہ خود اللہ تعالیٰ نے بڑی شدومد سے فرمایا کیا وہ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک اسی طرح چلتا رہا کہ لوگوں کو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ سورۂ براۃ دو ہیں یا ایک؟ عقل اس کو ہرگز باور نہیں کر سکتی کہ اتنے زمانے تک مسلمان اس سے ناواقف رہے ہوں، حالانکہ دوسری صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ دونوں جداگانہ سورتیں ہیں، سورۂ براۃ کے تمام وکمال ایک ساتھ نازل ہونے اور مجمع حجاج میں اس کی تلاوت کی روایت صحیح بخاری کے حوالہ سے اوپر مذکور ہو چکی۔ رہا یہ سوال کہ جب دونوں سورتیں جداگانہ ہیں تو ان کے بیچ میں دوسورتوں کی طرح بسم اللہ کیوں نہیں لکھی گئی، اس کا جواب یہ ہے کہ دوسورتوں کے بیچ میں بسم اللہ کا نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور بحکم الٰہی ترتیب دینے والے آنحضرتؐ ہیں، کسی تیسرے کو اس میں دخل نہیں ہے۔ ایسی حالت میں کوئی شخص اس کا سبب نہیں جان سکتا اور یہ معاملہ بھی حروف مقطعات کی طرح رموز قرآنی میں ہے۔

تیسری روایت حضرت حذیفہؓ کی ہے جس سے چند امور خلاف تواتر ظاہر ہوتے ہیں، وہ روایت یہ ہے:

یعنی زہری انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حذیفہ ابن الیمان جو فتح آرمینیہ اور آذربیجان میں شامل تھے قرآن کی قرأۃ میں اختلاف دیکھکر گھبرا گئے اور واپس ہو کر حضرت عثمانؓ سے کہا امیر المومنین قبل اس کے کہ کتاب اللہ کے اندر بھی ویسا ہی اختلاف پیدا ہو جائے جیسا کہ یہود و نصاریٰ کے درمیان ہے، اس امت کی خبر لیجئے، اس پر حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس سے صحیفے منگوائے (یعنی زید بن ثابتؓ کا جمع کیا ہوا قرآن بزمانہ حضرت ابوبکرؓ) اور کہلا بھیجا کہ اس کی نقلیں لیکر واپس کر دیں گے اور ایک مجلس زیدؓ بن ثابت اور تین قریشی صحابہ کی مرتب کر کے نقل کا کام ان لوگوں کے سپرد کر دیا اور یہ بھی حکم دیا کہ جہاں کہیں انصاری اور قریشیوں میں اختلاف ہو، تو قریش کے محاورہ کو ترجیح دیجائے، ان حضرات نے نقلیں کرلیں، اور حضرت عثمانؓ نے اصل حضرت حفصہؓ کو واپس کر دیا اور نقلوں میں سے ایک ایک نسخہ ہر ملک میں بھیجدیا اور حکم دیا کہ قرآن کے دوسرے نسخے جلا دیئے جائیں، ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھ سے زیدؓ بن ثابت کے بیٹے خارجہ نے بیان کیا کہ ان کے والد کہتے تھے کہ نقل کرتے وقت سورۂ احزاب کی آیت من المومنین رجالٌ الخ مجھ کو نہیں ملی، حالانکہ میں یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا، جب ہم نے اس کو تلاش کیا تو وہ خزیمہ بن ثابت انصاریؓ کے پاس ملی اور ہم نے اس کو اس کی سورت میں شامل کر دیا۔ (بخاری ج ۱۴۰ ص ۳)

اس روایت سے تین باتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک یہ کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک قرآن مجید کی قرأۃ میں دور دراز کے ممالک میں اس قدر اختلاف پیدا ہو گیا تھا جس کو دیکھکر حضرت حذیفہؓ سخت پریشان ہو گئے اور حضرت عثمانؓ کو اس کی اصلاح کی جانب توجہ دلائی اور یہ اختلاف اتنا شدید تھا کہ اگر اس کا تدارک نہ کیا جاتا تو قرآن میں بھی یہود و نصاریٰ کی کتب سماویہ کی طرح اختلاف ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

دوسری بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اس کا تدارک حضرت عثمانؓ نے یہ کیا کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے والے قرآن کی نقلیں کرا کے دور دراز ممالک میں بھیجدیں، اور اس نقل میں اختلاف کو اس طرح دفع کیا کہ صرف قریش کے محاورہ پر نقل کی بنیاد رکھی۔

تیسری بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے والے مصحف میں ایک آیت سورۂ احزاب کی درج نہ تھی جس کا احساس زید بن ثابتؓ کو عہد صدیقی میں نہ ہوا تھا اور عہد عثمانی میں نقل کے وقت اس کا احساس ہوا۔ مجلس ناقلین میں سے اس احساس میں وہ منفرد تھے چنانچہ انھوں نے اوران کے ساتھ دوسرے ناقلین نے اس آیت کی تلاش شروع کی اور آخر کار خزیمہ بن ثابتؓ انصاری کے پاس وہ آیت ملی۔ اور اس کو قرآن مجید میں اس کی جگہ شامل کر دیا گیا۔

اس روایت پر بھی سنداً اور درایۃً تنقید ضروری ہے، اس کی روایتی حیثیت یہ ہے کہ اس کے راوی بھی ابراہیم اور ابن شہاب زہری ہیں جن کے متعلق تفصیل کے ساتھ اوپر بحث ہو چکی ہے اور اس تنقید میں ان تمام امور پر نظر ڈالنی ضروری ہے جو اس روایت سے ظاہر ہوتے ہیں، ان میں پہلی بات قرآن مجید میں عظیم الشان اختلاف کا پایا جانا ہے۔ حالانکہ عہد رسالت سے لیکر عہد عثمانی اور اس کے بعد کے تمام زمانوں میں قرآن مجید کی جمع و تدوین اور تعلیم و اشاعت میں جو غیر معمولی اہتمام کیا گیا تھا اور جس تواتر سے وہ نقل ہوتا چلا آیا تھا اس کے بعد کسی ایسے بڑے اختلاف کا پایا جانا غیر ممکن ہے، جسے دیکھ کر حضرت حذیفہؓ گھبرا جائیں اور جس سے یہود و نصاریٰ کے سے اختلاف کا ان کو اندیشہ ہو۔

دوسرے قرآن تو قریش کے محاورہ کے مطابق نازل ہی ہوا تھا اور اس کے تحفظ اور اسی شکل میں اس کو مسلمانوں تک پہنچانے کی ذمہ داری خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھی اور اس کو بغیر کسی تغیر کے قائم رکھنے کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر تھی اسلئے اسکو بدلنے کی جرأت کون کر سکتا تھا۔

تیسری بات یعنی سورۂ احزاب کی ایک آیت کا نقل کے وقت پہلے نسخے میں نہ ملنا سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے، جمع قرآن والی روایت میں بھی اس کا ذکر ہے کہ چند آیتیں جو کہیں مل نہیں رہی تھیں بمشکل ملیں وہ سورۂ برأۃ کی آخری آیتیں تھیں، اور اس روایت میں بتلایا گیا ہے کہ سورۂ احزاب کی آیت نقل کے وقت نہیں مل رہی تھی۔ اب قابل غور امر یہ ہے کہ پہلے بھی انھیں زید بن ثابتؓ نے جمع و کتابت کا کام کیا تھا، اس وقت سورۂ برأۃ کی آخری آیتیں نہیں مل رہی تھیں اور سورۂ احزاب والی آیت یا تو اس وقت کم نہ تھی، یا ان کو اس وقت اس کا احساس نہیں ہوا، اگر گم نہ تھی تو بعد میں کیسے اس صحیفے سے گم ہو سکتی تھی جو خود انہی کا ترتیب دیا ہوا اور انہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا حفاظت کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور پھر حضرت حفصہؓ کے پاس رہا، اگر یہ خیال کیا جائے کہ اس آیت کے گم ہونے کا ان کو حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں ترتیب دیتے وقت احساس نہیں ہوا، تو یہ بھی غیر ممکن معلوم ہوتا ہے کہ زید بن ثابتؓ جیسا حافظ سورۂ احزاب کی اس آیت سے پہلی دفعہ غافل ہو، اور پہلی ترتیب کے سالہا سال بعد پھر جب نسخہ ان کے سامنے لایا جائے تو اس وقت احساس ہو، اسلئے عقلاً اس روایت کا یہ ٹکڑا محال معلوم ہوتا ہے اور اگر ان روایتوں کو جو تواتر کے خلاف ہیں صحیح تسلیم کر لیا جائے تو قرآن پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ اب بھی اس میں سے کچھ غائب ہو، جو وعدۂ الٰہی انا لہ لحافظون کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ ان روایتوں کا مضمون اہل السنۃ والجماعت کے عقائد کے خلاف[1] ہے۔ اس لئے قرآن کے تواتر کے مقابلہ میں یہ روایتیں ناقابل اعتبار ہیں، اور روایت و درایت

[1] روایات کے صحیح اور غلط ہونے کا یہ معیار بھی قابل غور ہے۔ یعنی جو روایت کسی فرقے کے کسی عقیدہ کے خلاف ہو وہ غلط ہو اور جو اس کے مطابق ہے صحیح ہے۔ (طلوع ...)

کی رو سے بھی غیر معتبر ہیں، ان تین روایتوں کے علاوہ بعض اور روایتیں بھی اختلاف قرأۃ اور اختلاف ترتیب کو ظاہر کرتی ہیں، ان سب کا اجمالی جواب یہ ہے کہ وہ اخبار احاد ہیں جو تواتر کے مقابلہ میں ہرگز قابلِ اعتبار نہیں، اگر خدا کو منظور ہے تو پھر کسی وقت ان روایتوں کی بھی تنقید پیش کی جائے گی۔ واللہ ھوالموفق للصواب والیہ المرجع والمآب اللھم احفظنا من العقائد الباطلۃ وآراء اھل الاھواء الفاسدۃ۔

استدراک

اس مضمون میں ایک بات ایسی ہے جس کی طرف ہم خاص طور پر توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ صاحبِ مضمون نے صفحہ ۴۰ و ۴۱ پر لکھا ہے:۔

قرآن مجید کی اہمیت اس کی متقاضی تھی کہ رسول اللہ صلعم خود اس کی جمع و ترتیب کا کام انجام دیتے۔ (جیسا کہ اوپر ثابت ہو چکا ہے) لیکن اگر بفرض محال آنحضرتؐ نے اس کام کو نہیں کیا تھا تو آپ کی وفات کے بعد صحابہ اور خلفاء کا اولین فرض یہ تھا کہ وہ بلا لحاظ اس کے کہ کسی جنگ میں قراء شہید ہوتے ہوں یا نہ شہید ہوئے ہوں قرآن کی جمع و ترتیب کا فرض انجام دیتے۔ کیونکہ قراء کی شہادت اگر نہ بھی ہوتی تو بھی موت سے کس کو مفر ہے۔ ایسی حالت میں صرف حفاظ قرآن کی موت ہی کے اندیشہ سے یہ فرض تھا کہ صحابہ اس کو جمع و مرتب کر کے اس کی نقلیں تمام ممالک اسلامیہ میں بھیج دیتے جس طرح حفاظ قرآن کو خلفا نے جا بجا بھیجا تھا۔

یعنی صاحبِ مضمون نے اس چیز کو بطور دلیل پیش کیا ہے کہ چونکہ قرآن کی اہمیت کا تقاضہ تھا اس لئے اسے رسول اللہؐ نے خود مرتب فرمایا اور خلفاء و صحابہ نے قرآن کے مستند نسخے تمام عالم اسلامی میں بھیجے۔ چنانچہ (امام ابن حزم کی تحقیق کے مطابق) جس وقت حضرت عمرؓ کا انتقال ہوا ہے قرآن مجید کے کم سے کم ایک لاکھ نسخے بلاد اسلامیہ میں موجود تھے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کی طرح حدیث بھی دین کا جزو تھی تو کیا اسکی اہمیت کے پیش نظر رسول اللہ صلعم اور صحابہؓ کا یہ فریضہ نہیں تھا کہ جو کچھ انھوں نے قرآن کی حفاظت، جمع و تدوین اور نشر و اشاعت کے متعلق کیا، وہی کچھ حدیث کے متعلق بھی کرتے؟۔ کیونکہ نہ رسول اللہؐ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب فرمایا اور نہ ہی خلفاء نے ہی ایسا کیا تو کیا اس سے صاف صاف یہی ثابت نہیں ہوتا کہ نہ رسول اللہ صلعم اپنی احادیث کو دین کا جزو سمجھتے تھے اور نہ ہی خلفاء اسے ایسا قرار دیتے تھے۔

ہم اپنے سوال کو پھر دہراتے ہیں کہ اگر قرآن اور حدیث دونوں دین کی میزان کے پلڑے تھے تو یہ کیوں ہوا کہ رسول اللہ صلعم نے قرآن کی ترتیب و تدوین میں تو اتنا اہتمام فرمایا اور اپنی احادیث کا کوئی مستند مجموعہ امت کو نہ دیا۔

کوئی ہے جو اس سوال کا جواب دے؟

(طلوع اسلام)

باسمہ تعالیٰ

تنقید مضامین احادیث نزولِ عیسیٰ علیہ السلام

(علامہ تمنا عمادی)

(قسط نمبر ۹)

یہاں تک تو صحیح بخاری کی پہلی حدیث اور اس کے ہم معنی صحیح مسلم و ترمذی میں جو حدیثیں ہیں ان میں جس قدر تفاوت لفظی و معنوی اور جتنی رکاکتیں ہیں ان کا بیان ہوا۔ اب ایک حدیث اسی سلسلے کی اور بھی سن لیجئے جو ابوداؤد میں مذکور ہے۔ جس کو ان پہلی حدیثوں سے اتنی مناسبت ہے کہ اس میں بھی قتل خنزیر و کسر صلیب و وضع جزیہ کا ذکر ہے۔ وہ یہ کہ حضرت ابوہریرہؓ سے عبدالرحمٰن بن آدم، ان سے قتادہ، ان سے ہمام بن یحییٰ، ان سے ہدبہ بن خالد، اور ان سے ابوداؤد اپنی سنن میں روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ میرے اور عیسیٰؑ کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ اور وہ اترنے والے ہیں، تو جب تم لوگ ان کو دیکھو، تو انھیں پہچان رکھنا، وہ ایک معتدل قامت کے مرد ہیں، رنگ سپیدی و سرخی کے درمیان، دو ہلکے زرد رنگ کے کپڑے ہیں۔ ایسا معلوم ہوگا کہ ان کے سر سے پانی کے قطرے ٹپک چلے، باوجودیکہ اس میں تری نہ ہوگی۔ تو وہ لوگوں سے اسلام پر قتال کریں گے، اور چکنا چور کردیں گے صلیب کو، اور قتل کریں گے خنزیر کو، اور جزیہ کو موقوف کردیں گے۔ اور ان کے زمانے میں اللہ تمام دینوں کو ہلاک کردے گا بجز اسلام کے۔ اور ہلاک کریں گے عیسیٰ مسیح دجال کو، تو باقی رہیں گے وہ روئے زمین پر چالیس برس تک، پھر وفات پائیں گے، تو مسلمان لوگ ان کے جنازے کی نماز پڑھیں گے۔

دیکھئے وہی حضرت ابوہریرہؓ ہیں جو عبدالرحمٰن بن آدم سے کیا کیا کچھ کہہ گئے، باوجود اس کے کہ عبدالرحمٰن بن آدم ایک معمولی آدمی تھے اور سعید بن المسیب جو ایک جلیل القدر قرشی صحابی کے صاحبزادے تھے، ان سے ایک مختصر سی بات کہہ کر رہ گئے۔ پوری حدیث ان سے نہیں بیان کی، بلکہ اتنا کہہ دیا کہ یضع الحرب وہ جنگ و جدال کو موقوف کردیں گے۔ اور عبدالرحمٰن بن آدم سے کہا کہ وہ اسلام کے لئے لوگوں سے قتال کریں گے، وہ تو خدا بھلا کرے کم فہمی کا جنھوں نے یضع الحرب کو یضع الجزیہ بنا کر صحیح بخاری کا بھرم کسی قدر رکھ لیا۔

غرض عبدالرحمٰن بن آدم والی حدیث کو ابن شہاب زہری اور عطا بن میناؑ والی حدیثوں سے بس اتنی ہی مضمونی شارکت ہے کہ اس میں بھی کسر صلیب و قتل خنزیر و وضع جزیہ کا ذکر آگیا ہے، ورنہ اس حدیث میں ایسی ایسی باتیں ہیں جن کا وہم بھی کبھی سعید بن المسیب اعطا بن مینا اور زہری کو نہ ہوا ہوگا۔ عطا بن مینا والی روایت میں تو صرف واذا العشار عطلت سے ایک مفہوم سرقہ کرکے اس کے ساتھ دلوں کی کینہ و بغض و عداوت اور حسد کے نکال دینے کا اضافہ کیا گیا تھا۔ مگر ابن آدم صاحب نے دیکھا کہ عطا بن میناکے چلنے والے کو ہم کیا کہیں گے جب دل سے گھڑ کر ہی روایت کرنا ہے تو ایسی باتیں بیان کی جائیں جو اور کسی کے واہمہ میں بھی نہ آئی ہوں۔ چنانچہ اب دیکھیں کہ اس حدیث کو ان کے سوا اور کوئی بھی روایت نہیں کرتا۔ اور یہ بھی حضرت ابوہریرہؓ ہی سے اس کو روایت کررہے ہیں۔

صحیح بخاری کی پہلی حدیث اور اس کے مختلف طرق جو صحاح کی دوسری کتابوں میں ہیں اور اس کے ہم معنی حدیثیں جو صحاح میں ہیں ان سب کا تماشا تو آپ دیکھ چکے۔ اب بخاری کی دوسری حدیث اور اس کے طرق اور اس کے ہم معنی یا قریب المعنی حدیثیں جو صحاح میں ہیں، ان کا تماشا بھی ذرا دیکھ لیجئے۔

بخاری کی دوسری حدیث

امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابن بکیر نے، ان سے لیث نے، ان سے یونس نے، ان سے ابن شہاب نے، ان سے نافع مولی ابی قتادۃ الانصاری نے حدیث بیان کی کہ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ کس طرح ہوگے جبکہ ابن مریم تم میں اتریں گے اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا؟ اتنا کہہ کر امام بخاری فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی متابعت عُقَیل اور اوزاعی نے بھی کی ہے۔ ابن حجر فتح الباری میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عُقَیل اور اوزاعی نے اس حدیث میں یونس کی متابعت کی ہے۔ یعنی یونس کی طرح عقیل اور اوزاعی بھی اس حدیث کو ابن شہاب زہری سے روایت کرتے ہیں۔ اس متابعت سے بس صرف اسی قدر معلوم ہوا کہ ابن شہاب زہری نے یہ حدیث ضرور روایت کی ہے۔ ابن شہاب سے نافع مولی ابن قتادہ نے واقعی کہا تھا یا نہیں؟ اور نافع سے حضرت ابوہریرہؓ نے واقعی کہا تھا یا نہیں، ان باتوں پر اس متابعت سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔

صحیح مسلم میں یہ حدیث خود یونس سے بھی مروی ہے اور ابن شہاب کے بھتیجے محمد بن عبداللہ بن مسلم سے بھی مروی ہے اور ابن ابی ذئب سے بھی۔ لیکن امام بخاریؒ نے ابن شہاب کے بھتیجے اور ابن ابی ذئب کی متابعتوں کا حال معلوم نہ تھا اور نہ وہ عقیل و اوزاعی کے ساتھ ابن ابی ذئب اور محمد بن عبداللہ بن مسلم کی متابعتوں کا ذکر بھی ضرور کرتے۔ ممکن ہے کہ جس وقت صحیح بخاری میں یہ حدیث داخل کی گئی تھی، اس وقت تک یہ دونوں متابعتیں گھڑی نہیں گئی ہوں

مگر ابن شہاب کے بھتیجے صاحب اپنے چچا ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ تم لوگ کس طرح ہوگے جب ابن مریم تم میں اتریں گے اور پھر تمہاری امامت کریں گے۔ اور ابن ابی ذئب کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا فَاَمَّكُمْ مِنْكُمْ۔ جو درحقیقت ایک غلط اور بے معنی فقرہ ہے۔ یا تو یونس کی طرح صاف کہتے فامامکم منکم یعنی تمہارا امام تم میں سے ہوگا۔ یا ابن شہاب زہری کے بھتیجے کی طرح بیان کرتے فَاَمَّكُمْ یعنی حضرت عیسیٰؑ تمہاری امامت کریں گے۔ یہ فامکم کے بعد بے جوڑ منکم کا لفظ کیا لے آئے۔ اگر یونس کی روایت کے مطابق یہ مراد ہو کہ حضرت عیسیٰؑ امام نہ ہوں گے بلکہ تمہیں میں کوئی شخص امام ہوگا تو اَمَّكُمْ مَنْ هُوَ مِنْكُمْ کہنا تھا، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اَمَّ کے فاعل حضرت عیسیٰؑ نہیں ہیں بلکہ کوئی اور شخص ہے۔ اور اگر زہری کے بھتیجے کی روایت کے مطابق مفہوم ادا کرنا تھا تو کہنا تھا کہ فامکم وھو منکم یعنی حضرت عیسیٰؑ تمہاری امامت کریں گے تمہیں میں کے ایک فرد ہو کر (یعنی امت محمدی بن کر) یہ فامکم منکم کہہ کر جو اَمَّ کے فاعل کو غائب کر دیا یا مشتبہ کر دیا منکم کا لفظ بڑھا کر، کہ پتہ ہی نہیں ملتا کہ یہ منکم کس سے متعلق ہے، کچھ ابن ابی ذئب ہی کو زیب دیتا ہے۔

فَاَمَّكُمْ کے سر پر جو فائے تعقیب ہے اس کا عطف نَزَلَ پر ہے اس لئے جو نَزَلَ کا فاعل ہوگا وہی اَمَّ کا بھی فاعل ہوگا اس لئے یہاں حضرت عیسیٰؑ کے سوا کسی دوسرے کی امامت کا مفہوم نکل ہی نہیں سکتا۔ اگر کسی دوسرے کی امامت کا مفہوم نکالنا ہو تو فائے تعقیب کو

واوعطف سے پہلے بدل لیجئے جس کی اب گنجائش نہیں۔ ہاں اگر اَمَّ کا فاعل کوئی دوسرا مذکور ہوتا مثلاً فامکم من ھو منکم کہا گیا ہوتا تو یہ تعقیب صحیح ہوتی۔ مطلب یہ ہوتا کہ پہلے حضرت عیسیٰؑ کا نزول ہوگا اس کے بعد نماز کی امامت کوئی دوسرا شخص کریگا جو تمہیں میں کا ہوگا۔ مگر یہاں جب فاعل مذکور نہیں ہے تو لامحالہ اَمَّ کی ضمیر فاعلی حضرت عیسیٰؑ کی طرف پھریگی۔ تو جب اَمَّ کے فاعل حضرت عیسیٰؑ ہوئے تو پھر منکم کا تعلق اپنے ماقبل سے ناممکن ہے اس لئے دھوکا لفظ بڑھا ہی کر منکم کا لفظ اَمَّکم کے بعد لایا جا سکتا ہے تاکہ ھو مبتدا ہو اور منکم ظرف مستقر ہونے کی حیثیت سے اس کی خبر نہ ہو، اور مبتدا و خبر مل کر جملہ حالیہ ہو جس کا ذوالحال اَمَّ کی ضمیر ہو جو حضرت عیسیٰؑ کی طرف پھیری گئی ہے۔ غرض منکم سے پہلے جب تک من ھو یا وھو کا لفظ بڑھایئے یہ منکم کا لفظ کھڈے پر کبھی ٹھیک نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ اگر کوئی کہدے کہ آپ یہاں من ھو یا وھو دونوں سے کسی کو منکم سے پہلے محذوف کیوں نہیں مان لیتے۔ عربی عبارتوں میں تو محذوفات بہت ہوا کرتے ہیں تو اس توجیہ سرد و عذر لنگ کو سن کر کافیہ پڑھنے والا بچہ بھی ہنس دیگا۔ کیونکہ مسند الیہ جس پر جملے کی بنیاد کھڑی کی جاتی ہے وہ محذوف نہیں ہوتا خصوصاً مواقع اشتباہ میں۔

ابن ابی ذئب تو اس اَمکم منکم والی حدیث کو ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں مگر ابن ابی ذئب سے اس کو ولید بن مسلم روایت کرتے ہیں۔ جس وقت انھوں نے ابن ابی ذئب سے اس غلط جملے کو سنا تو فوراً ان کو اس کی غلطی محسوس ہوئی۔ تو ولید نے ابن ابی ذئب سے کہا کہ ہم سے اوزاعی نے یہ حدیث ابن شہاب ہی سے اور انھوں نے نافع مولیٰ ابی قتادہ ہی سے روایت کی ہے کہ واما مکم منکم یعنی حضرت عیسیٰؑ اتریں گے اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا۔ امام مسلم لکھتے ہیں کہ اس کے جواب میں ابن ابی ذئب نے کہا کہ تم سمجھتے ہو کہ اَمَّکُمْ مِنْکُمْ کیا ہوا؟ (یعنی اس کے کیا معنی ہیں؟)۔ ولید بن مسلم کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ آپ ہی بتایئے۔ تو ابن ابی ذئب نے کہا کہ حضرت عیسیٰؑ تمہاری امامت کریں گے تمہارے رب کی کتاب اور تمہارے نبی کی سنت کے مطابق (یعنی امامت کریں گے حضرت عیسیٰؑ ہی۔ مگر قرآن اور سنت محمدی کے مطابق)۔ تعجب ہے کہ ولید بن مسلم یہ سن کر مطمئن کس طرح ہو گئے؟ انھوں نے ابن ابی ذئب سے یہ نہیں پوچھا کہ تم جو مطلب بیان کر رہے ہو وہ اس جملے سے کس طرح نکل سکتا ہے؟ اگر واقعی یہ مطلب ہوتا تو کہا جاتا کہ فامکم علی ملتکم، یا امّکم علی دینکم۔ یا امکم وھو منکم ہی کہتے۔ باشر العظیم! افصح العرب والعجم نبی امی کی زبان مبارک سے عربی کے ایسے غلط جملے کبھی نہیں نکل سکتے تھے۔

مگر ابن ابی ذئب جن کا نام محمد بن عبدالرحمٰن ہے وہ قریشی اور مدنی کہے جاتے ہیں، اس لئے ان کی طرف اس حدیث کی اور اس غلط جملے کی اور پھر اس کی لایعنی تاویل کی نسبت مجھکو بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔ خود ولید بن مسلم عجمی الاصل بنی امیہ کے غلام آزاد کردہ تھے۔ ہو سکتا ہے کہ خود انھیں نے فامکم منکم ایک جملہ بنایا ہو، مگر جب کسی نے اس کو غلط کہا اور اس کا مطلب پوچھا تو ایک قصہ گھڑ کر غریب ابن ابی ذئب کے سر تھوپ دیا ہو۔ کیونکہ یہ مدلس تھے بھی۔ امام مالکؒ سے ایسی دس حدیثیں روایت کیں جن کی کوئی اصل نہیں تھی۔ (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۷۵)۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ حدیث ولید بن مسلم کو وِجادۃً کہیں ملی تھی۔ یعنی انھوں نے کسی جگہ لکھی ہوئی پائی تھی۔ کاتب نے واما مکم منکم ہی لکھنا چاہا تھا مگر سہواً امامکم کا میم الف کتابت میں چھوٹ گیا تھا۔ ولید بن مسلم نے اس کو

اَمۡکُمۡ پڑھا۔ تھے عجمی اس لئے عربیت کی کمزوری محسوس نہ کرسکے۔ اور مدلس بھی تھے روایت کرنے لگے اس کو حدثنا ابن ابی ذئب کہہ کے۔ جب لوگوں نے اعتراض کیا تو ایک تاویل اپنی ذہانت سے گھڑ کر انھوں نے ابن ابی ذئب غریب کی طرف منسوب کردی۔ یہی بات قرینِ عقل معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

غرض ابن شہاب زہری کے بھتیجے اور یونس بن یزید دونوں ہی اس حدیث کو ابن شہاب ہی سے بیان کرتے ہیں مگر دونوں کے بیان میں پورا تضاد ہے اور ابن ابی ذئب والی روایت جو زہری ہی سے ہے، اس میں جو مہمل تطابق کی بدنما صورت دکھائی گئی ہے، اور جس زنگ آلود آئینے کے ذریعے، اس سے آپ اچھی طرح واقف ہوچکے۔ اور یہ مفہوم کہ حضرت عیسیٰؑ ہی امام ہوں گے، مگر وہ قرآن و سنت محمدیؐ کے تابع ہوں گے۔ ایک دوسری صریح حدیث کے بالکل خلاف ہے اور وہ حدیث بھی اسی صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کی طرف منسوب ابوالزبیر کی روایت سے ہے جس کا ذکر حضرت ابوہریرہؓ کی طرف منسوب حدیثوں کی تنقید کے بعد آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ اس میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے مسلمانوں کی یہ درخواست ہوگی کہ آپ امامت فرمایئے تو وہ انکار کریں گے اور مسلمانوں ہی میں سے کسی کو امام و امیر ہونے کے لئے فرمائیں گے۔

یہ اختلاف و تضاد ان حدیثوں میں ایسا ہے جس سے محدثین کسی طرح بھی انکار نہیں کرسکتے، اور نہ کسی تاویل سے تطابق کی کوئی صورت پیدا کرسکتے ہیں۔ اور خود محدثین اور شارحینِ حدیث کو اپنی اس چپقلش کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔

تمام اہل علم کے نزدیک اذا تعارضا تساقطا کا ایک مسلمہ اصول ہے۔ یعنی جب دو متضاد باتیں باہم متعارض ہوں اور ان دونوں میں سے ایک کو دوسری پر ترجیح دیکر مرجوح کو ساقط کرنے کی گنجائش نہ ہو تو دونوں باتیں اعتبار سے ساقط ہوجائیں گی۔ اس لئے یہ حدیثیں جو ایک دوسری کی ضد ہیں اور باہم متعارض ہیں، اہل علم کے متفقہ اصول کے مطابق دونوں ساقط الاعتبار ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ یہ سب موضوع اور من گھڑت ہیں۔

روایت پرست حضرات کہیں گے کہ تعارض و تضاد تو صرف حضرت عیسیٰؑ کی امامت اور اقتدا میں ہے، ان کے دوبارہ روئے زمین پر آنے میں تو کوئی تعارض نہیں ہے، ان سب حدیثوں میں جو متفق علیہ قدر مشترک ہے، یعنی حضرت عیسیٰ کا دوبارہ زمین پر آنا، اس کو تو صحیح ماننا پڑیگا تو اس کے دو جواب ہیں۔ ایک تو یہ کہ تعارض امامت و اقتدا میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ مسلمانوں کی جماعت کے امام ہوں گے، یا امام کوئی دوسرا مسلمان ہوگا اور حضرت عیسیٰؑ مقتدی ہوں گے۔ تو آپ کم سے کم ان دونوں متعارض باتوں کو تو ساقط ضرور کریں گے یعنی حضرت عیسیٰؑ نہ امام ہوں گے اور نہ مقتدی ہوں گے۔ تو پھر وہ کیا ہوں گے؟ کہدیجئے کہ وہ نماز ہی نہیں پڑھیں گے کہ امامت و اقتدا کا جھگڑا سامنے آئے۔ اگر یہ نہیں کہہ سکتے تو یہی کہہ دیجئے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت سے الگ تنہا نماز پڑھیں گے۔ تو پھر جب وہ مسلمانوں کی جماعت سے الگ رہیں گے تو مسلمانوں کو کیا؟ وہ آئے تو کیا؟ اور نہ آئے تو کیا؟

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ایسی صورت میں مسلمانوں کو ان کے تشریف لانے کی خوشخبری ہی سنانا بے سود ہے۔ اس لئے بے سود قدرِ مشترک اپنے بے سود ہونے کی

وجہ سے خود بخود اعتبار سے ساقط ہو کر رہے گا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ وضاعین و کذابین کا یہ بھی اصول رہا ہے کہ کسی غلط مفہوم کو ثابت کرنے کیلئے وہ چند حدیثیں گھڑتے ہیں، اور ان میں اس غلط مفہوم کو بطور قدر مشترک ان سب حدیثوں میں رکھکر اس مفہوم کے بعض لوازمات میں تھوڑا اختلاف ان اپنی من گھڑت حدیثوں میں قصداً رکھکر پھر انھیں لوازمات پر ایک بحث چھیڑ دیتے ہیں تاکہ وہ اصل مفہوم زیر بحث ہی نہ آنے پائے اور لوگ انھیں لوازمات کے اختلاف میں الجھکر رہ جائیں اور کچھ دنوں بعد وہ اصل مفہوم غلط، جس کے لئے وہ حدیثیں گھڑی گئیں وہ سب کا متفق علیہ مسئلہ ہو جائے اور بحیثیت قدر مشترک کے مسلّم سمجھا جائے، اور لوازمات کے اختلاف کو غیر اہم قرار دیکر اس کی طرف سے چشم پوشی کی جائے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ بخوف طوالت مثالیں پیش کرنے سے احتیاط کرتا ہوں، مگر اس سے پہلے بھی اپنی کسی تحریر میں میں نے اس کا ذکر کیا ہے اور وہاں شاید کچھ مثالیں بھی دی ہیں اور وہ مضمون غالباً طلوع اسلام میں چھپ چکا ہے، یا شاید البیان لاہور میں چھپا ہو۔

مذکورہ بالا سب حدیثیں صحیح مسلم جلد اول کتاب الایمان کی تھیں، اب جلد دوم کتاب الفتن و شرائط الساعۃ کی حدیثوں کی تنقید بھی ملاحظہ فرمایئے۔

امام مسلم زہیر بن حرب سے، وہ معلیٰ بن منصور سے، وہ سلیمان بن بلال سے، وہ سہیل سے، وہ اپنے والد ابو صالح ذکوان سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت نہیں قائم ہوگی جب تک اہل روم اعماق اور وابق میں نہ اتریں (اعماق اور وابق دو مقام کے نام ہیں شام کے علاقے میں، جو حلب سے قریب ہیں) تو ان کے مقابلے کے لئے مدینے سے ایک فوج نکلے گی جو روئے زمین پر اس وقت کے بہترین انسانوں پر مشتمل ہوگی۔ تو جب دونوں طرف صف بندی ہو جائے گی تو اہل روم مسلمانوں سے کہیں گے کہ تم لوگ ہمارے اور ہمارے ان لوگوں کے درمیان راستہ چھوڑ دو جو ہمارے لوگ اپنا دین چھوڑ بیٹھے ہیں (یعنی جن لوگوں نے دین نصاریٰ چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے) تو مسلمان کہیں گے کہ خدا کی قسم ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ہم تمہارے اور اپنے بھائیوں کے درمیان راستہ نہیں دے سکتے۔ تو پھر مسلمان اُن رومیوں سے قتال کریں گے تو ایک تہائی مسلمان بھاگ نکلیں گے جن کی توبہ اللہ کبھی قبول نہیں کرے گا۔ اور ایک تہائی شہید ہوں گے اور وہ اللہ کے نزدیک تمام شہیدوں سے افضل ہوں گے۔ اور ایک تہائی ان رومیوں پر فتحیاب ہوں گے، جو پھر کسی آزمائش میں نہیں ڈالے جائیں گے تو وہ قسطنطنیہ فتح کر لیں گے۔ تو جس وقت وہ آپس میں مال غنیمت تقسیم کرتے ہوں گے اسی درمیان میں اپنی تلواریں زیتون کے درخت سے لگا دیں گے۔ اس وقت شیطان ان لوگوں میں آواز بلند کریگا کہ ان المسیح قد خلفکم فی اھلیکم یعنی مسیح دجال تمہارے پیٹھ پیچھے تمہارے اہل و عیال میں پہنچا ہوا ہے تو وہ لوگ نکلیں گے اور یہ خبر غلط ہوگی۔ تو پھر جب وہ لوگ ملک شام میں آجائیں گے تو وہ نکلے گا۔ تو وہ لوگ قتال کے لئے سامان ہی درست کرتے ہوں گے اور صفیں ہی مرتب کر رہے ہوں گے کہ اس درمیان میں جس وقت نماز قائم کی جا رہی ہوگی عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اتریں گے۔ تو جب ان کو اللہ کا دشمن دیکھے گا تو پگھلنے لگے گا جس طرح نمک پانی سے پگھلتا ہے، تو اگر چھوڑ دیتے اس کو تو بالکل پگھل جاتا، یہاں تک کہ ہلاک ہو جاتا۔ لیکن اللہ اس کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے گا تو مسلمانوں کو اپنے حربے میں اس کا خون دکھائے گا۔"

یہ ہے جس کو حدیث رسول کہا جاتا ہے، جس کی تہمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لگائی جاتی ہے۔ اللہ خود اپنے ہاتھ سے مسیح دجال کو قتل کریگا اور اپنا خون آلود حربہ مسلمانوں کو دکھائے گا۔ تاکہ مسلمانوں کو یقین ہو کہ واقعی اللہ ہی نے دجال کو خود قتل کیا۔ معاذ اللہ من تلک الھفوات ما قدروا اللہ حق قدرہ۔ سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون۔

اس حدیث میں جو باتیں حضرت ابوہریرہ نے بقول راوی، ابو صالح ذکوان سے بیان کیں وہ باتیں نہ سعید بن المسیب سے کہیں نہ عطار بن میناسے، نہ عبدالرحمٰن بن آدم سے جس طرح عبدالرحمٰن بن آدم سے بعض باتیں ایسی کہدی تھیں جو کسی دوسرے سے نہیں کہیں۔ اور عطار بن میناسے بعض ایسی باتیں کہیں جو اُن کے سوا کسی اور سے نہیں کہیں۔ خدا جانے حضرت ابوہریرہؓ ایسا کیوں کرتے تھے۔ جب ساری باتیں ان سے رسول اللہ صلعم نے فرمائی تھیں تو یہ بھی جس سے کہتے پوری بات کہتے۔ یہ کیا کہ جو باتیں ایک سے کہیں وہ دوسرے سے نہیں کہیں، جو دوسرے سے کہیں وہ تیسرے سے نہیں کہیں۔ پوری بات کسی ایک سے بھی نہیں کہی۔ معلوم نہیں حضرت ابوہریرہؓ نے اس میں کیا مصلحت سمجھی۔ اصل یہ ہے کہ نزول عیسیٰؑ کے متعلق حدیثیں عیسائی غلاموں نے جو نومسلم تھے گھڑیں۔ ان کی جماعت میں وہ منظم سازش نہ تھی جو ایرانی ملاحدہ کی جماعت میں تھی۔ اس لئے یہ حدیثیں بغیر باہمی مشورے کے انفرادی طور سے گھڑی گئیں، اسلئے کسی نے بعض باتیں سوچیں اور ایک حدیث بنا کر حضرت ابوہریرہؓ کی طرف منسوب کردی۔ کسی نے بعض دوسری باتیں گھڑیں اور حدیث بنا کر انھیں کی طرف منسوب کردی۔ یہی ہوا۔ اسی وجہ سے ان حدیثوں میں اس قدر تفاوت آپ کو نظر آرہا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی وجہ اتنے اختلافات کی سمجھ میں نہیں آتی۔

پھر اللہ تعالیٰ کا خود اپنے ہاتھوں سے مسیح دجال کو قتل کرنا اور مسلمانوں کو اس کے خون سے آلودہ اپنا حربہ دکھانا ایسی مضحکہ خیز باتیں ہیں جن کو وہی بیان کرسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی سُبُّوحیّت و قُدُّوسیّت سے بالکل بے خبر ہو۔ ایک عالم بالقرآن مسلمان ایسا نہیں کہہ سکتا۔ چہ جائیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرمائیں۔ معاذ اللہ من ذلک۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کی حدیثیں تو خود دجالوں ہی کی من گھڑت ہیں جن کی تہمت رسول اللہ صلعم پر باندھی گئی ہے اور حضرت ابوہریرہؓ پر اس کی روایت کا بہتان باندھا گیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی طرف منسوب حدیثوں کی سیر تو آپ کرچکے۔ اب ذرا حضرت جابر بن عبداللہؓ پر جس حدیث کی تہمت لگائی ہے اس پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجئے۔

"امام مسلم اپنے سلسلۂ اسناد کے ماتحت فرماتے ہیں کہ جابر بن عبداللہؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر مخالفین پر غالب رہتے ہوئے ان سے قتال کرتی رہے گی۔ تو عیسیٰ بن مریم صلی اللہ علیہ وسلم اتریں گے تو مسلمانوں کا امیر اُن سے کہے گا کہ تشریف لائیے اور نماز پڑھائیے۔ تو فرمائیں گے کہ نہیں۔ تم میں کے بعض، بعض پر امیر ہوں گے۔ یہ ایک عزت افزائی ہے اس امت کی اللہ کی طرف سے۔"

اس حدیث کا ذکر پہلے آچکا ہے اور یہ حدیث روایت پرستوں کے نزدیک اس بات کیلئے نص قطعی ہے کہ مسلمانوں کے امیر، اور مسلمانوں کے امام حضرت عیسیٰؑ نہ ہوں گے بلکہ مسلمانوں ہی کی جماعت میں کا کوئی اور شخص ہوگا۔

دوسری بات اس حدیث سے یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ آئیں گے تو اپنی پہلی حیثیت ہی پر وہ رہیں گے اور مسلمانوں کی

اس متابعت کا کوئی اثر تقویت نہیں پڑتا۔ بس اتنا معلوم ہوا کہ شعبہ نے اس کو روایت کیا ہے، جس کو دو شخص بیان کر رہے ہیں مگر شعبہ جن سے روایت کر رہے ہیں یعنی نعمان بن سالم وہ تو ایک مجہول الحال شخص ہیں جس کی تفصیل قسط سوم[1] میں گذر چکی۔

بہر حال نفس حدیث یہ ہے کہ "یعقوب بن عاصم بن عروہ بن مسعود الثقفی کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرو سے سنا، ان کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ وہ کیا حدیث ہے جس کو آپ بیان کرتے ہیں کہ قیامت قائم ہوگی ایسے ایسے وقت تک۔ تو انھوں نے کہا کہ سبحان اللہ یا لاالہ الا اللہ! یا اسی طرح کا کوئی کلمہ ادا کیا۔ (جتنی عبارت پر خط کھنچا ہے وہ تحویل یعنی دوسری حدیث میں نہیں ہے) میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب کسی سے کوئی حدیث نہیں بیان کروں گا۔ میں نے تو یہی کہا تھا کہ تم لوگ عنقریب تھوڑے ہی زمانے کے بعد ایک بہت بڑی بات دیکھوگے، خانہ کعبہ میں آگ لگے گی، اور یوں ہوگا، ووں ہوگا۔ (دوسری حدیث میں ہے کہ میں نے کہا تھا کہ تم لوگ دیکھوگے تھوڑے ہی زمانے کے بعد ایک بڑی بات، تو ہوئی خانہ کعبہ کی آتش زدگی۔ شعبہ نے کہا کہ یہی یا اس کے مانند یعنی بات انھوں نے یہی یا کچھ اسی طرح کی۔) پھر کہا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ میری امت میں دجال نکلے گا تو چالیس تک ٹھہرے گا۔ میں نہیں جانتا کہ چالیس دن یا چالیس مہینے یا چالیس برس۔ تو اللہ تعالیٰ مبعوث کرے گا عیسیٰ بن مریم کو، گویا کہ وہ عروہ بن مسعود ہونگے تو وہ دجال کو ڈھونڈھیں گے اور اس کو ہلاک کریں گے۔ پھر لوگ سات برس تک اس طرح رہیں گے کہ ان کے درمیان کسی قسم کی عداوت نہ ہوگی۔ پھر اللہ ایک ٹھنڈی ہوا شام کی طرف سے اٹھائے گا تو پھر ایسا ایک شخص بھی روئے زمین پر نفرہ باقی نہ رہے گا جس کے دل میں ایک ذرے کے برابر بھی بھلائی ہو مگر اس کو موت آکر رہے گی۔ یہاں تک کہ اگر تم میں کوئی شخص بیچ پہاڑ میں بھی داخل ہو جائے گا تو اس میں بھی وہ ہوا داخل ہو کر رہے گی اور اس کو مار کر رہے گی۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اس کو رسول اللہ صلعم سے سنا ہے۔ کہا کہ باقی رہ جائیں گے پھر برے لوگ جو پرندوں کی طرح ہلکے پھلکے برائیوں کی فضا میں تیز پرواز ہوں گے اور درندوں کی طرح ہوشیار اور چوکنا ہوں گے۔ نہ وہ کسی اچھے کام کو اچھا کام سمجھیں گے نہ برے کام کو برا کام جانیں گے۔ تو شیطان ان کے سامنے انسانی صورت میں آکھڑا ہوگا اور کہے گا کہ تم کیا میری بات نہیں مانوگے؟ تو وہ لوگ کہیں گے کہ کیا ارشاد ہوتا ہے؟ تو وہ ان لوگوں سے کہے گا کہ بت پرستی کے لئے، اور وہ لوگ رزق کی بہتات اور اچھے سامان عیش میں ہوں گے۔ پھر صور پھونکا جائے گا تو اس کو نہیں سنے گا کوئی مگر یہ کہ جھکائے ایک طرف گردن اور اٹھائے دوسری طرف (دور کی پست آواز سننے کے لئے یا بہرے لوگ سر ایک طرف جھکا کر ایک طرف کا کان اوپر کرتے ہیں اور دوسرا کان نیچے کر کے سننے کی کوشش کرتے ہیں۔ غالباً یہاں یہی مراد ہے۔ حدیث کی اصل عبارت یوں ہے فلا یسمعہ احد الا اصغیٰ لیتا ورفع لیتا۔ لیت بالکسر صفحۂ گردن کو کہتے ہیں۔ اور اصغیٰ کے معنی ہیں امال یعنی جھکایا) اور پہلا شخص جو اس کو سنے گا وہ ایک شخص ہوگا جو اپنے اونٹ کے حوض کو لیپ پوت کر رہا ہوگا۔ تو وہ چیخ اٹھے گا اور چیخ اٹھیں گے سب لوگ۔ پھر بھیجے گا اللہ یا انھوں نے کہا کہ اتارے گا اللہ بارش گویا کہ وہ شبنم ہوگی (یعنی پھوہار کی طرح ہلکی ہلکی بارش ہوگی) یا سایہ ہوگا (یعنی ابر سائبان کی طرح ہر طرف چھایا ہوا ہوگا) شک کرنے والے نعمان ہیں (یعنی نعمان بن سالم جو اس حدیث کو یعقوب بن عاصم بن عروہ سے روایت کر رہے ہیں انھیں یہ شک پیدا ہوا کہ یعقوب نے طل طائے مہملہ سے یعنی شبنم کہا یا ظل ظائے معجمہ سے

[1] طلوع اسلام ۱۹ اکتوبر ۵۳ء۔

جماعت کے ایک فرد نہ ہوں گے۔ کیونکہ حدیث میں یہ مذکور نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ مقتدی بن کر جماعت میں شامل ہو جائیں گے۔ ورنہ یہ تفریق کیسی کہ میں تمہارا امیر و امام نہ ہوں گا بلکہ تمہیں میں سے کوئی امیر و امام ہوگا۔ اگر یہ بھی اپنے مخاطبین ہی کی جماعت کے ایک فرد ہوں گے تو کم سے کم یہ تو انھیں کہنا چاہئے کہ "میرے سوا کوئی دوسرا امیر و امام ہو" اور پھر یہ دونوں باتیں صحیح مسلم کی اس دوسری حدیث کے بالکل خلاف ہیں، جیسا کہ اوپر میں نے بیان کیا۔ ابن جوزی نے ایک بات نکالی ہے کہ جو روایت پرستی کے نقطۂ نگاہ سے بہت معقول سمجھی جاتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ امامت و امارت سے اس لئے انکار کریں گے کہ مقتدی بن کر عام مسلمانوں کے ساتھ ایک مسلمان کے پیچھے نماز پڑھنے سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ وہ نبی بن کر نہیں آئے ہیں بلکہ امت محمدی کے ایک فرد بن کر آئے ہیں۔ نبوت تو ختم ہو چکی لا نبی بعدی اور آنحضرت صلعم کے خاتم النبیین ہونے کے اعلانوں کے بعد اب کوئی نبی، نبی کی حیثیت سے آ ہی نہیں سکتا۔ ہاں ایسا شخص آ سکتا ہے جو کبھی نبی تھا۔ مگر اب وہ نبی کی حیثیت میں نہیں ہے بلکہ حضرت خاتم النبیین صلعم کا ایک امتی ہے۔ مگر مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے حوالے سے اسی پر زور دیتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ آئیں گے تو امامت وہی کریں گے اور مسلمانوں کے امیر و امام وہی ہوں گے، لیکن صحیح مسلم کی اس حدیث کو غلط بھی نہیں کہتے۔ ہمارے علماء بھی حدیثوں کے تخالف و تضاد کے وقت عجیب کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں مگر اپنے قلبی کشمکش کو ظاہر نہیں کر سکتے۔

ابن جوزی کی تاویل بھی الفاظ حدیث سے باہر ہے۔ حدیث میں ایسا کوئی لفظ نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ مسلمانوں ہی میں سے کوئی امام ہوگا اور حضرت عیسیٰؑ مقتدی بن کر جماعت میں شامل ہو جائیں گے، بخوبی ممکن ہے کہ اس وقت حضرت عیسیٰؑ مسلمانوں کی جماعت سے الگ تنہا اپنی نماز ادا کر لیں۔ حدیث کی عبارت میں ان دونوں باتوں کا احتمال ہے۔ واذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال یعنی جب مخالف احتمال بھی موجود ہے تو پھر موافق پہلو ہی کو پیش کر کے دلیل میں پیش کرنا، اور مخالف پہلو سے چشم پوشی کرنا صحت استدلال کو باقی نہیں رکھتا۔

لیکن ابن جوزی نے ان متضاد حدیثوں کے تضاد کے مٹانے کی پھر بھی کوئی صورت نہیں نکالی، اور وہ بیچارے کیا نکالتے، کوئی صورت نکل بھی سکتی ہو۔

جس طرح یہ عبداللہ بن جابر والی حدیث صرف صحیح مسلم میں ہے، اسی طرح ایک حدیث عبداللہ بن عمرو بن العاص کی طرف منسوب بھی صرف صحیح مسلم میں مروی ہے، جس کو حضرت ممدوح سے یعقوب بن عاصم بن عروہ بن مسعود الثقفی روایت کرتے ہیں۔ جو صحیح مسلم میں ایک تحویل کے ساتھ مذکور ہے۔ اگرچہ اس کو تحویل نہیں قرار دیا ہے بلکہ دو حدیثیں ہی امام مسلم نے بنا دی ہیں۔ حالانکہ وہ محض ایک تحویل ہے کیونکہ صرف امام مسلم کے شیخ اور شیخ کے شیخ بدلے ہوئے ہیں باقی سب روایت دونوں طرق کے ایک ہی ہیں۔ پہلی حدیث امام مسلم عبید اللہ بن معاذ العنبری سے اور وہ اپنے والد معاذ العنبری سے روایت کرتے ہیں۔ اور دوسری حدیث کو امام مسلم، محمد بن بشار سے وہ محمد بن جعفر سے روایت کرتے ہیں۔ اور معاذ العنبری اور محمد بن جعفر دونوں ہی شعبہ سے وہ نعمان بن سالم سے اور وہ یعقوب بن عاصم بن عروۃ بن مسعود الثقفی سے روایت کرتے ہیں۔ اس لئے یہ متابعت شعبہ کے بعد سے چلتی ہے، اسلئے نفس حدیث کو

یعنی سائبان کیا) تو اس بارش سے لوگوں کے جسم گلنے لگیں گے۔ پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب لوگ کھڑے (ادھر اُدھر) دیکھتے ہوں گے۔ پھر کہا جائے گا اے لوگو! چلے چلو اپنے رب کی طرف اور ٹھہراؤ ان کو، یہ لوگ پوچھے جانے والوں میں ہیں۔ پھر کہا جائے گا (یعنی فرشتوں کو) نکالو ان لوگوں کو جو دوزخ کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ تو پوچھا جائے گا، کتنے میں سے کتنے؟ تو کہا جائے گا ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے۔ تو کہا جائے گا کہ یہی وہ دن ہے جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا اور یہی وہ دن ہے جس دن حقیقتیں واضح ہو جائیں گی۔

یہ حدیث جن دو طرق سے مروی ہے جن میں سے ایک کو دوسرے کی تحویل کہہ سکتے ہیں۔ ان دونوں میں نفس حدیث بالکل ایک ہی ہے تھوڑا فرق جو مذکور ہوا وہ محض تمہید میں ہے۔ اسلئے طلّ اور ظلّ کا شک جو نعمان بن سالم کو پیدا ہوا کہ یعقوب نے طل کہا یا ظل کہا یہ شک انھیں ہرگز پیدا نہ ہوتا اگر وہ واقعی یعقوب بن عاصم بن عروہ سے یہ حدیث سنے ہوئے ہوتے۔ یقیناً یہ حدیث ان کو کہیں لکھی ہوئی ملی اور کاتب نے نقطہ نہیں دیا تھا مگر بے جگہ اس لئے پڑھنے میں نعمان بن سالم کو یہ شک پیدا ہوا۔ کیونکہ دونوں لفظوں میں تجنیس خطی ہے، تجنیس لفظی نہیں ہے وضاعین حدیث جھوٹی جھوٹی حدیثیں بنا بنا کر محدثین کے ذخیرۂ احادیث میں داخل کر دیا کرتے تھے، ان کی کتابوں میں لکھ دیا کرتے تھے۔ اور وہ پھر ان کو پڑھ کر حدثنا فلاں کہہ کر روایت کیا کرتے تھے۔ اپنا لکھا ہوا ہو تو یاد رہے دوسروں کا لکھا ہوا بعض جگہ مشتبہ ہو جاتا تھا تو اس قسم کا شک ان کو پیدا ہو جاتا تھا جس کو وہ اس لئے بھی ظاہر کر دیتے تھے کہ کسی دوسرے کے پاس بھی یہ حدیث ہوئی تو معلوم نہیں وہ کس طرح اس کو روایت کریگا۔ جو لفظ دو طرح پڑھا جاتا ہے اس کو دونوں طرح اپنا شک ظاہر کر کے بیان کر دو۔ دوسرا شخص ان میں سے جس طرح بھی روایت کریگا میری حدیث کی متابعت ایک طریقے سے تو ہو جائے گی۔ اور پھر اس طرح میری دیانتداری بھی ثابت ہو جائے گی۔

اور ایک بات اور بھی اس حدیث میں قابل غور ہے جو کسی دوسری حدیث میں نہیں ہے۔ وہ یہ کہ یعقوب بن عاصم بن عروہ بن مسعود الثقفی کو جو حدیث عبداللہ بن عمرو بن العاص سے ملی اس میں اس کا ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جو دوبارہ زمین پر آئیں گے تو وہ ان کے دادا عروۃ بن مسعود الثقفی کے صورۃً مشابہ ہوں گے۔ اس طرح راوی نے حضرت عیسیٰؑ ہی کے آنے کی خبر نہیں دی بلکہ اپنے دادا کے نہیں تو ان کے ایک ہمشکل کے آنے کی بھی خبر دیدی۔ اور ضمناً اپنے دادا کی اہمیت بھی قائم کر دی کہ حضرت عیسیٰؑ جو آئیں گے تو یعقوب بن عاصم کے دادا عروہ بن مسعود کے ہمشکل ہوں گے۔ گویا کہ وہی ہوں گے۔ پھر پوتے صاحب جتنا بھی اس پر فخر کریں کم ہے۔ یہ حدیث صرف یعقوب بن عاصم، عروہ بن مسعود کے پوتے کو ملنی بھی چاہئے تھی۔ اسی لئے اور کسی دوسرے سے اس حدیث کی روایت نہیں ملتی۔

اب ابو سریحہ و ابو طفیل والی حدیثوں کو بھی ملاحظہ فرمالیجئے جن میں سے صرف ایک حدیث سنن ابی داؤد میں ہے۔ باقی ساری حدیثیں صرف صحیح مسلم میں آپ کو ملیں گی۔ یعنی دوسرے محدثین کی کتابوں میں ان کو داخل کرنے کا موقع یاروں کو نہ مل سکا۔ بہرحال۔ یہ تو میں لکھ چکا ہوں کہ ابو سریحہ کی ساری حدیثیں صرف ابو الطفیل سے مروی ہیں۔ اور یہ حدیثیں ابو الطفیل سے صرف فرات القزاز یا عبدالعزیز بن رفیع بھی روایت کرتے ہیں۔ بجز ایک شخص کے جس کا نام شعبہ نے کسی مصلحت سے ظاہر نہیں کیا۔ مگر وہ نامعلوم شخص اس حدیث کو صرف ابو سریحہ ہی تک رکھتا ہے۔ رسول اللہ صلعم تک نہیں پہنچاتا۔ اور غالباً یہی شخص اس حدیث میں نزول عیسیٰؑ کا ذکر بھی نہیں کرتا۔ بلکہ نزولِ عیسیٰؑ کی جگہ ایک تیز ہوا کے چلنے کا ذکر کرتا ہے جو لوگوں کو دریا میں ڈال دیگی۔ اس لئے اس نامعلوم شخص کی روایت نزول عیسیٰؑ کے متعلق کر

بھی یا نہیں، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اسلئے نزول عیسیٰؑ کے متعلق جو حدیثیں بواسطہ ابوالطفیل ابوسریحہ سے مروی ہیں وہ صرف فرات القزاز یا عبدالعزیز بن رفیع ہی روایت کرتے ہیں۔ یہ عبدالعزیز والی روایتیں صرف صحیح مسلم میں ہیں، اور فرات والی صرف ایک روایت ایک تحویل کے ساتھ ابوداؤد میں اور تین تحویلوں کے ساتھ صحیح مسلم میں ملتی ہیں۔ فرات القزاز سے سفیان بن عیینہ روایت کرتے ہیں کہ "ہم لوگ آپس میں مذاکرہ کر رہے تھے کہ آنحضرت صلعم ہم لوگوں کے پاس تشریف لائے، اور پوچھا کہ تم لوگ کس بات کا ذکر کر رہے ہو؟ تو لوگوں نے کہا کہ ہم لوگ قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ وہ کبھی قائم نہ ہوگی جب تک اس سے پہلے تم لوگ دس نشانیاں نہ دیکھ لو۔ پھر آپ نے فرمایا۔ دخان (دھوئیں) کا، اور دجال کا، اور دابۃ کا اور جانب مغرب سے طلوع آفتاب کا اور نزول عیسیٰ بن مریمؑ کا اور یاجوج وماجوج کا، اور تین خسوف کا ایک خسف مشرق میں، ایک خسف مغرب میں اور ایک خسف جزیرۂ عرب میں (خسف چندر گہن کو بھی کہتے ہیں اور زمین کے دھنس جانے کو بھی۔ معلوم نہیں کیا مراد ہے؟) اور آخری علامت آگ ہوگی جو یمن سے نکلے گی، لوگوں کو ہنکا کر محشر کی طرف لے جائے گی۔

اور اسی حدیث کو ابوالطفیل سے بقول شعبہ عبدالعزیز بن رفیع نے بھی روایت کیا ہے۔ مگر وہ اس میں رسول اللہ صلعم کا ذکر نہیں کرتے۔ (تو پھر معلوم نہیں عبدالعزیز بن رفیع نے ان باتوں کو ابوالطفیل کی طرف منسوب کیا یا ابوسریحہ کی طرف؟) پھر امام مسلم کہتے ہیں (یا شعبہ کا قول نقل کرتے ہیں) کہ دونوں میں سے ایک نے (یعنی فرات القزاز اور عبدالعزیز بن رفیع میں سے ایک نے) دسویں علامت نزول عیسیٰ بن مریم کو بتایا اور دوسرے نے کہا کہ وہ ایک ہوا ہوگی جو لوگوں کو دریا میں ڈال دیگی (یہ دوسرے بظاہر عبدالعزیز بن رفیع ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ فرات القزاز سے جتنی روایتیں ہیں وہ نزول مسیح ہی کے متعلق ہیں۔)

پھر امام مسلم محمد بن بشار سے وہ شعبہ سے وہ فرات القزاز سے وہ ابوالطفیل سے اور وہ ابوسریحہ سے روایت کرتے ہیں کہ "ہم لوگ آنحضرت صلعم کے دریچے میں بیٹھے تھے اور اس دریچے کے نیچے ہم لوگ باتیں کر رہے تھے۔ اور اسی حدیث کے مانند حدیث بیان کی۔ اور شعبہ نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں (یا گمان کرتا ہوں) کہ انھوں نے (فرات القزاز نے) کہا کہ وہ (یعنی وہ ہوا) اتریگی ان کے ساتھ جہاں لوگ اتریں گے اور دوپہر کو آرام کریگی جہاں لوگ آرام کریں گے۔ اور شعبہ نے کہا کہ ایک شخص نے (جس کا نام نہیں بتایا) مجھ سے ابوالطفیل سے اور اور ابوالطفیل نے ابوسریحہ سے حدیث بیان کی اور اس کو مرفوع نہیں کیا (یعنی رسول اللہ صلعم تک نہیں پہنچایا) کہا ان دونوں شخصوں میں سے ایک نے نزول عیسیٰ بن مریمؑ اور دوسرے نے کہا ایک ہوا جو لوگوں کو دریا میں ڈال دیگی (اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے وہاں دو شخصوں سے مراد فرات القزاز اور عبدالعزیز بن رفیع ہیں۔ یہاں بھی انھیں دونوں کو مراد ہونا چاہئے۔ مگر یہاں فرات القزاز اور رجل یعنی ایک شخص کا ذکر ہے۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ وہ ایک شخص عبدالعزیز بن رفیع ہی ہیں)۔

اور پھر امام مسلم سے محمد بن المثنیٰ ان سے ابوالنعمان الحکم بن عبداللہ العجلی ان سے شعبہ فرات القزاز ہی سے روایت کرتے ہیں ابوالطفیل سے اور وہ ابوسریحہ سے کہ ہم لوگ باتیں کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلعم ہم لوگوں کے سامنے تشریف لائے اور معاذ ابن ابی جعفر جیسی حدیث بیان کی۔ (اس روایت سے پہلے یا بعد کو بھی ابن ابی جعفر کی روایت سے کوئی حدیث مروی نہیں ہے۔ نہ مذکورہ روات میں سے کسی

راوی کی کنیت ابو جعفر ہے۔ میرے پاس صحیح مسلمؒ کا ایک قلمی قدیم نسخہ بھی ہے۔ شرح نوادی کے ساتھ اس میں بھی ابن ابی جعفر ہی لکھا ہوا ہے اسلئے اس کو طباعت یا کتابت کی غلطی نہیں کہہ سکتے۔ غالباً یہ امام مسلم ہی کی سبقت قلم سے غلطی رہ گئی۔ یا جس نے بر صحیح مسلم میں اس حدیث کو داخل کیا ہے جلدی میں اسی کے قلم سے ابن ابی عمر کی جگہ ابن ابی جعفر لکھا گیا۔ اس سے پہلے معاذ العنبری کی حدیث اور اس سے پہلے ابن ابی عمر المکی کی حدیث ضرور گذر چکی ہے۔ معاذ العنبری نے شعبہ سے اور وہ فرات القزاز سے۔ اور ابن ابی عمر المکی نے اسحٰق بن ابراہیم کے ساتھ سفیان بن عیینہ سے اور سفیان نے فرات القزاز سے جس کو روایت کیا ہے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا)

اور ابن مثنیٰؒ نے کہا کہ ہم سے ابو النعمان حکم بن عبداللہ نے بیان کیا شعبہ سے، انھوں نے عبدالعزیز بن رفیع سے انھوں نے ابو الطفیل سے، انھوں نے ابو سریحہ سے اسی طرح۔ دسویں علامت نزول عیسیٰ بن مریم کو بیان کیا (مگر) شعبہ نے کہا کہ عبدالعزیز نے اس کو مرفوع نہیں کہا۔ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچایا۔)

اب آپ ان سب حدیثوں کی بھول بھلیاں اور شعبہ کی روایتوں کے گورکھ دھندے پر غور کیجئے اور کوشش کیجئے کہ ان حدیثوں سے کوئی اور ایسا مفہوم نکالیں جس سے سب روایتوں کی چول صحیح طور سے بیٹھ جائے اور ایک بات سمجھ میں آجائے کہ اصل حدیث یہ ہو سکتی ہے۔ مگر پہلے ایک اور حدیث جو ابوداؤدؒ میں ہے اس کو بھی سن لیجئے اور پھر سب کو پیش نظر رکھکر غور فرمائیے۔ ابوداؤد ہنادؒ اور مسددؒ سے وہ دونوں ابو الاحوص سے وہ فرات القزاز سے وہ ابو الطفیل سے اور وہ ابو سریحہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دریچے کے سایے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ تو ہم لوگوں نے اپنی آوازوں کو بلند کیا۔ آنحضرت صلعم نے (گھر ہی میں بیٹھے بیٹھے، کیونکہ آپ کے باہر تشریف لانے کا ذکر اس روایت میں نہیں ہے) فرمایا کہ کبھی قائم نہ ہوگی (یعنی قیامت) یا کبھی نہ ہوگی جب تک اس سے پہلے دس علامتیں ظاہر نہ ہولیں۔ مغرب کی طرف سے طلوع آفتاب، دابہ کا نکلنا، یاجوج و ماجوج کا نکلنا، دجال، اور عیسیٰ بن مریم، اور دخان، اور تین خسوف، ایک خسف مغرب میں، ایک خسف مشرق میں، اور ایک خسف جزیرۃ العرب میں۔ اور آخری نشانی یمن کی طرف سے آگ کا ظاہر ہونا، جو عدن کی کسی پست ترین حصہ زمین سے نکلے گی، لوگوں کو ہنکا کر محشر کی طرف لے جائے گی۔

یہ حدیثیں جو تعدد طرق قائم کرکے متعدد بنائی گئی ہیں، درحقیقت ایک ہی حدیث ہے جو حضرت ابو سریحہ کی طرف منسوب کی گئی ہے اور اس کی روایت کا سہرا صرف حضرت ابو الطفیل کے سر باندھا گیا ہے۔ جن سے فرات القزاز روایت کر رہے ہیں۔ عبدالعزیز بن رفیع کو بھی فرات کا شریک روایت بنایا گیا ہے۔ اور پھر ایک رجلؓ کو بھی جس کا نام نہیں بتایا گیا۔ مگر میں نے بتادیا کہ وہ کوئی تیسرے شخص نہیں ہیں، وہی عبدالعزیز بن رفیع ہیں۔ عبدالعزیز بن رفیع اور اس رجل کی روایت کو بمثلہ، اور بنحوہ کہکر فرات القزاز ہی کے روایت کے مطابق بھی ظاہر کیا گیا ہے اور پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ عبدالعزیز نے اپنی روایت میں اس حدیث کو مرفوع نہیں کہا۔ یعنی رسول اللہ صلعم تک نہیں پہنچایا۔ بلکہ یہی امام مسلم صاف طور سے یہ بھی لکھ رہے ہیں کہ لایذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی عبدالعزیز بن رفیع جو روایت ابو الطفیل کے واسطے سے ابو سریحہ سے روایت کرتے ہیں اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہیں

کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ رجل بھی جو دراصل عبدالعزیز ہی ہیں اس حدیث کو رسول اللہ صلعم تک نہیں پہنچاتے۔ تو پھر عبدالعزیز اور اس رجل کی روایت فرات القزاز کی روایت کے مانند کس طرح ہوئی؟ اگر یہ حدیث رسول اللہ صلعم تک نہیں پہنچائی گئی اور آپ کا ذکر اس میں نہیں آیا، تو پھر قیامت سے پہلے ان دس علامتوں کا ظہور کس نے ابوسریحہ اور ان کے ساتھیوں کو بتایا؟ آخر عبدالعزیز بن رفیع نے اس حدیث کو کس طرح روایت کیا، بغیر رسول اللہ صلعم کا ذکر کئے۔ یہ حدیث فرات القزاز کی حدیث کے مانند کس طرح روایت کی جا سکتی ہے؟ کوئی صاحب اس حدیث کو جو فرات القزاز سے مروی ہے اس میں سے رسول اللہ صلعم کا ذکر نکال کر دیکھیں کہ پھر اس حدیث کی کیا شکل ہو جاتی ہے۔ اگر یہ حدیث مرفوع نہ ہو یعنی اس کی نسبت رسول اللہ صلعم تک نہ پہنچائی جائے تو یہ ماننا پڑیگا کہ حضرت ابوالطفیل سے حضرت ابوسریحہ نے کہا کہ قیامت کے آنے سے ان دس علامتوں کا ظہور ضروری ہے اور انھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا کہ ہم لوگ آنحضرتؐ کے دروازے کے نیچے بیٹھے باہم مذاکرہ کر رہے تھے اور آنحضرت صلعم ہم لوگوں کے پاس تشریف لائے وغیرہ ذلک اور یہ کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ قیامت سے پہلے ان دس علامتوں کا ظہور ضروری ہے۔ یہ سب ابوالطفیل نے عبدالعزیز سے بالکل نہیں کہا۔ بلکہ اتنا بھی نہیں کہا کہ ابوسریحہ نے رسول اللہ صلعم سے سنا کہ قیامت سے پہلے ان دس علامتوں کا ظہور ضروری ہے۔ لم یرفعہ اور لا یذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تو معنی ہی یہ ہوئے کہ بقول عبدالعزیز بن رفیع ابوالطفیل کو ابوسریحہ نے یہ بتایا کہ قیامت سے پہلے ان دس علامتوں کا ظہور ضروری ہے۔ اس لئے امام مسلم کا ان جگہوں میں بشلہ اور بنحوہ کہنا بالکل خلاف عقل ہے۔ عبدالعزیز کی حدیثیں کبھی فرات کی حدیثوں کے مانند نہیں ہو سکتیں۔

اس کے علاوہ ان سب حدیثوں میں جو دس علامتیں بیان کی گئی ہیں، ان کے بیان کا انداز یہی ہے کہ جو علامت پہلے ظاہر ہوگی اس کا ذکر پہلے کیا ہے، پھر اس کے بعد والی کا، پھر اس کے بعد والی کا۔ یہانتک کہ دسویں علامت حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کے نزول کو قرار دیا ہے۔ ابوداؤد میں ترتیب یوں ہے۔ مغرب سے طلوع آفتاب، دابہ کا نکلنا، یاجوج و ماجوج کا نکلنا، دجال، عیسیٰ بن مریمؑ، دھواں تین خسوف خسف مغرب، خسف مشرق، خسف جزیرۃ العرب۔ اور آخری دسویں علامت یمن کی طرف سے آگ کا ظہور، جو لوگوں کو محشر کی طرف لے جائے گی۔

اور صحیح مسلم میں ترتیب یوں ہے دھواں، دجال، دابہ، طلوع شمس من المغرب۔ نزول عیسیٰ۔ یاجوج و ماجوج، خسف مغرب، خسف مشرق، خسف جزیرۃ العرب اور آخری علامت وہ آگ جو یمن کی طرف سے ظاہر ہوگی اور لوگوں کو محشر کی طرف لے جائیگی۔ یہ ترتیب ابن عیینہ کی روایت میں ہے جو فرات سے مروی ہے۔ مگر فرات ہی سے شعبہ اس ترتیب سے بیان کرتے ہیں۔ خسف بالمغرب خسف بالمشرق، خسف فی جزیرۃ العرب، دخان، دجال، دابہ، یاجوج و ماجوج، طلوع شمس من المغرب اور آگ جو قعر عدن سے ظاہر ہوگی۔ ان نو علامتوں کے بعد شعبہ فرماتے ہیں کہ (فرات القزاز اور عبدالعزیز بن رفیع) دونوں میں سے ایک نے کہا دسویں علامت کے متعلق کہ وہ نزول عیسیٰ بن مریم ہے۔ اور دوسرے نے کہا کہ وہ ہوا ہے جو لوگوں کو دریا میں ڈال دیگی۔

محمد بن المثنیٰ جو ابوالنعمان حکم بن عبداللہ سے اور وہ شعبہ سے اور وہ فرات القزاز سے اور وہ ابوالطفیل سے اور وہ ابوسریحہ سے

روایت کرتے ہیں۔ اس کے متعلق بنحو حدیث معاذ وابن ابی جعفر لکھا ہے۔ ابن ابی جعفر تو غلط ہے ابن ابی عمری سہی تو پہلی ترتیب ابن ابی عمر کی حدیث میں ہے جس کو ابن ابی عمر ابن عیینہ سے اور وہ فرات سے روایت کرتے ہیں اور دوسری ترتیب معاذ العنبری سے ہے جس کو وہ شعبہ سے اور وہ فرات ہی سے روایت کر رہے ہیں اور دونوں کی ترتیب میں اختلاف ہے۔ اس لئے محمد بن مثنیٰ والی روایت دونوں کے مانند کس طرح ہو سکتی ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ علامتیں یہی دس محمد بن مثنیٰ والی روایت میں بھی مذکور ہیں، چاہے ترتیب ان میں سے کسی کے بھی موافق ہو۔ تو یہ بھی ممکن ہے کہ محمد بن المثنیٰ کی روایت میں ان دونوں کی روایتوں سے مختلف کوئی تیسری ترتیب ہو۔ اس لئے ان کی روایت کو بھی لکھ دینا تھا۔ اور اگر بخیال اختصار اس کو ترک کیا تو پھر معاذ والی روایت میں بھی بمثلہ لکھ دینا کیوں نہیں کافی سمجھے۔ علامتیں تو سب میں ایک ہی جیسی ہیں۔ یقیناً اختلاف ترتیب ہی کی وجہ سے دونوں کی روایتیں لکھدیں اور بنحوہ لکھکر اختصار سے کام نہیں لیا۔ اسی طرح یہاں بھی محمد بن المثنیٰ کی روایت لکھ دینا تھی تاکہ معلوم ہو کہ ان کی روایت معاذ کے بیان کے مطابق ترتیب رکھتی ہے یا ابن ابی عمر کے بیان کے مطابق۔ یا ان دونوں کی بیان کردہ ترتیب سے مختلف یہ ایک تیسری ترتیب بتا رہے ہیں۔ غرض دو مختلف بیانوں کے مثل کسی ایک بیان کو قرار دینا ایک عجیب بات ہے۔

اگر علامتوں کے ذکر میں جو علامت آخر میں مذکور ہے اس کو آخری علامت یا دسویں علامت نہ کہا جاتا تو سمجھا جا سکتا تھا کہ یہاں ترتیب تقدم و تاخر ان علامتوں کے ظہور میں ظاہر کرنا مقصود نہیں ہے۔ مگر سب سے اخیر میں جس کو بیان کیا ہے اس کو آخری علامت اور کسی جگہ دسویں علامت کہہ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ جس ترتیب سے علامتوں کا ذکر کیا ہے اسی ترتیب سے ایک کے بعد دوسری علامت ظاہر ہوگی۔ بہرحال۔ تینوں ترتیب آپ کے سامنے ہیں۔ ایک تو ابوداؤد والی، اور دوسری صحیح مسلم والی۔ ابوداؤد اور مسلم کی پہلی ترتیب کے رو سے حضرت عیسیٰؑ کا نزول پانچویں علامت ہے۔ اور صحیح مسلم کی دوسری ترتیب کے اعتبار سے حضرت عیسیٰؑ کا نزول آخری دسویں علامت ٹھہرتا ہے۔ ان تینوں ترتیبوں کی رو سے مغرب کی طرف سے جب تک آفتاب طلوع نہ ہو اُس وقت تک حضرت عیسیٰؑ کا نزول ہو نہیں سکتا۔ اس لئے اس وقت تک جتنے مسیح موعود ہونے کے مدعی ہوئے، قرآن مبین کے خلاف تو ان کا دعویٰ ہے ہی لیکن ان من گھڑت حدیثوں کے رو سے بھی ان کا دعویٰ غلط ہی ٹھہرتا ہے۔ اور ان تنکوں کا سہارا بھی انھیں گرداب ضلالت میں سہارے کا کام نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد ان تینوں ترتیبوں پر ایک مفصل بحث ہو سکتی ہے خصوصاً دوسری حدیثوں سے تعارض و تضاد وغیرہ دکھا کر مگر مضمون بہت طول ہو چکا ہے اس لئے اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں۔ درخانہ اگر کس است حرفے بس است۔

اب ایک من گھڑت صحابی نواس بن سمعان کے سر جو حدیثیں تھوپی گئی ہیں ذرا ان کی سیر کر لیجئے۔ صحیح مسلم میں ان کی ایک لمبی چوڑی حدیث مروی ہے اسی کو اصل قرار دیکر باقی صحاح کی حدیثوں کا اسی سے مقابلہ کر کے تنقید کی جائے تو بہتر ہے۔ صحیح مسلم میں ایک تحویل کے ساتھ یہ حدیث مذکور ہے اس کو تحویل نہ کہئے بلکہ یوں سمجھئے کہ امام مسلم اس حدیث کو امام مسلم، دو شیوخ سے روایت کر رہے ہیں کیونکہ امام مسلم اس کو زہیر بن حرب سے بھی روایت کرتے ہیں اور محمد بن مہران سے بھی اور وہ دونوں ولید بن مسلم سے وہ عبدالرحمن بن

یزید بن جابر سے، وہ یحییٰ بن جابر الطائی سے، وہ عبدالرحمٰن بن جبیر بن نُفیر سے وہ اپنے باپ جبیر بن نفیر سے، اور وہ نواس بن سمعان کے سوا انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلعم نے کل رات دجال کا ذکر فرمایا تو اپنی آواز بہت پست کی اور کافی بلند کی، یہاں تک کہ ہم لوگوں نے گمان کیا کہ ان کھجوروں کے جھنڈ میں وہ موجود ہے۔ تو جب صبح کو ہم لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ہم لوگوں میں اس خوف و ہراس کو محسوس فرمایا تو پوچھا کہ تم لوگوں کا کیا حال ہے؟ ہم لوگوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! حضورؐ نے جو رات دجال کا ذکر فرمایا اور آواز پست و بلند فرمائی یہاں تک کہ ہم لوگوں نے گمان کیا کہ وہ ان کھجوروں کے جھنڈ میں موجود ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ مجھکو تم لوگوں کے متعلق دجال کے سوا دوسری بات ڈرا رہی ہے، وہ یہ کہ وہ نکلے اور میں تم میں موجود رہوں تو میں اس سے مقابلہ کرنے والا ہونگا تمہارے سوا۔ اور اگر وہ نکلا اور میں تم لوگوں میں موجود نہ ہوا تو ہر شخص اپنی ذات سے اس کا مقابلہ کرنے والا ہوگا۔ اور اللہ میرے پیٹھ پیچھے ہر مسلم کا مددگار رہے۔ وہ دجال جوان ہوگا، کرڑے کرڑے بالوں کے جوڑے والا، ایک آنکھ کی پھولی والا۔ عبدالعزیٰ ابن قطن کے مشابہ۔ تو تم میں جو شخص اس کو پائے تو چاہیئے کہ اس پر پڑھے سورۂ کہف کے ابتدائی حصے۔ وہ نکلنے والا ہے شام و عراق کے درمیانی راستے سے۔ پھر داہنے بائیں ہر طرف فتنہ و فساد پھیلانے والا ہوگا۔ اے اللہ کے بندو! اس وقت ثابت قدم رہنا۔ تو ہم لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ کتنک روئے زمین پر رہے گا؟ تو آپ نے فرمایا کہ چالیس دن۔ ایک دن ایک سال کے برابر، ایک دن ایک مہینے کے برابر، ایک دن ایک جمعہ (ہفتہ) کے برابر اور اس کے باقی سب دن تم لوگوں کے دنوں کے برابر ہوں گے۔ (یعنی ۴۰ دنوں تک وہ روئے زمین پر فساد پھیلاتا رہے گا) تو ہم لوگوں نے عرض کیا کہ تو وہ دن جو سال بھر کے برابر ہوگا، کیا ہم لوگوں کو اس میں ایک دن کی نماز کافی ہوگی؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ اندازہ قائم کیجیو اس کے اندازہ کے مطابق۔ ہم لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اس کی تیز رفتاری زمین پر کیسی ہوگی؟ آپ نے فرمایا بارش باراں کی طرح جس کے پیچھے ہوا ہو۔ تو وہ آئے گا قوم کے پاس اور ان کو دعوت دے گا تو لوگ اس کی دعوت قبول کرلیں گے، اور اس پر ایمان لے آئیں گے، تو وہ آسمان کو حکم دے گا تو بارش ہونے لگے گی اور زمین کو حکم دیگا تو وہ اگانے لگے گی اور ان کے مویشی چراگاہ کی طرف جائیں گے لمبے لمبے بھرپور تھن والے اور تنے ہوئے پاکھوں والے۔ پھر وہ قوم کے پاس آئے گا تو لوگ اس کو دھتکار دینگے اور اس کی بات کو رد کردیں گے تو وہ لوگ صبح کریں گے ایسی حالت میں کہ مکروکید میں مبتلا ہوں گے، ان کے ہاتھوں میں ان کے مال میں سے کچھ بھی نہ ہوگا۔ اور وہ (دجال) جائے گا ویرانوں میں اور کہے گا نکال اپنے خزانوں کو! تو خزانے اس کے پیچھے پیچھے چلیں گے جیسے مدھ مکھیوں کا شہد۔ پھر وہ بلائے گا ایک مرد کو جو کڑیل جوان ہوگا، تو اس کو تلوار سے مارے گا اور دو ٹکڑے کردیگا کہ دونوں ٹکڑے الگ الگ پھینکے جائیں گے۔ ایسا کہ دونوں کے درمیان ایک تیر کا فاصلہ ہوگا۔ پھر وہ اس کو بلائے گا تو اس کے سامنے وہ (مقتول) آکھڑا ہوگا اور بشاش ہوجائے گا اس کا چہرہ اور ہنسنے لگے گا۔ وہ اسی حالت میں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم کو اسی درمیان میں مبعوث کرے گا۔ تو وہ اتریں گے منارۃ البیضاء کے پاس دمشق کے مشرقی حصے میں، دو زعفرانی کپڑوں میں، اپنی دونوں ہتھیلیاں دو فرشتوں کے مونڈھوں پر رکھے ہوئے۔ جب وہ سر جھکالیں گے تو قطرے ٹپکنے لگیں گے اور جب سر اٹھائیں گے تو بکھریں گے ان کے سر سے چاندی کے سے قطرے موتیوں جیسے۔ تو کسی کافر کے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ ان کے سانس کی ہوا محسوس کرے اور نہ مرجائے۔ اور ان کا سانس وہاں تک

پہنچے گا جہاں تک ان کی نظر جائے گی۔ تو وہ دجال کو ڈھونڈھیں گے، یہانتک کہ اس کو پائیں گے قریۂ لُدّ کے دروازے پر (لُدّ بیت المقدس کے قریب ایک قریہ تھا) تو اس کو مار ڈالیں گے۔ پھر عیسیٰؑ آئیں گے اس قوم کے پاس جن کو اللہ نے اس کے مکر سے محفوظ رکھا تھا۔ تو عیسیٰؑ ان کے چہروں سے گرد ملال پونچھیں گے اور جنت میں ان کے لئے کیسے کیسے درجے ہیں اس کے متعلق ان سے باتیں کریں گے۔ تو وہ اسی حالت میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام پر وحی کریگا، کہ میں نے نکالا ہے اپنے کچھ بندوں کو، کسی کے دو ہاتھ ایسے نہیں کہ ان سے قتال کرے (دو ہاتھ ایسے نہیں یعنی اتنی قوت نہیں) تو جمع کر میرے بندوں کو اس پہاڑ کی طرف۔ اور اللہ مبعوث کریگا یاجوج و ماجوج کو، اور وہ ہر سوراخ سے نکلنے لگیں گے۔ تو ان کے پہلے لوگ گذریں گے بحیرۂ طبریہ پر تو پی جائیں گے وہ لوگ جو کچھ اس میں ہوگا۔ تو پھر ان کی دوسری جماعت اس جگہ گذریگی اور کہیگی کہ اسمیں یکبار تو پانی تھا۔ اور عیسیٰ نبی اللہ اور ان کے ساتھی ان کے گھیرے میں گھر جائیں گے، یہانتک کہ ایک گائے کا سر ان کیلئے بہتر ہوگا اس سے جتنا کہ آج تمہارے لئے سو اشرفیاں بہتر ہیں تو راغب ہوں گے (اللہ کی طرف) نبی اللہ عیسیٰ اور ان کے اصحاب تو بھیجے گا اللہ ان پر (یاجوج ماجوج کی قوم پر) (وہ) کیڑے (جو اونٹ اور بھیڑ بکری کی ناک میں پیدا ہوتا ہے اور مویشی اس سے مرجاتے ہیں) تو صبح کو وہ سب کے سب مردہ ہوں گے، جیسے ایک شخص کی موت ہوتی ہے۔ (یعنی پوری قوم اس طرح مریگی جیسے ایک انسان مرتا ہے تو اس کے سارے اعضا مردہ ہوتے ہیں) پھر نبی اللہ عیسیٰ اور ان کے اصحاب پہاڑ سے نیچے اتریں گے تو زمین پر بالشت بھر بھی جگہ ایسی نہ پائیں گے جہاں ان کے سڑے گلے جسم اور ان کی بدبو نہ ہو، تو نبی اللہ عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے اصحاب اللہ کی طرف راغب ہوں گے تو اللہ کچھ پرندوں کو بھیجیگا اعناق البُخت کی طرح، تو لاد کر لے جائیں گے ان کو اور پھینک دیں گے جہاں چاہے گا اللہ۔ پھر بھیجے گا اللہ بارش باراں کو جس سے نہ کوئی مٹی کا مکان پوشیدہ رہے گا نہ اونی خیمہ۔ تو وہ بارش کا پانی دھودے گا روئے زمین کو یہانتک کہ بنادے گا اس کو صاف مثل آئینے کے۔ پھر کہا جائے گا زمین کو اپنے پھل اگا، اور اپنی برکتوں کو واپس لا۔ تو پھر اس دن کھائے گی ایک جماعت ایک انار سے، اور اس کے چھلکے کی چھتری بنائے گی (یعنی اتنے بڑے بڑے انار ہوں گے کہ ایک انار سے ایک جماعت کا پیٹ بھر جائے گا اور اس کے چھلکوں کی لوگ چھتریاں بنائیں گے) اور مویشیوں کے دودھ میں برکت دی جائے گی۔ یہانتک کہ جو اونٹنی ابھی بچہ جنی ہے (اس کا دودھ) انسانوں کی ایک بڑی جماعت کے لئے کافی ہوگا۔ اور جو گائے ابھی بچہ جنی ہے (اس کا دودھ) ایک پورے قبیلے کے لئے کافی ہوگا۔ اور جو بھیڑ ابھی بچہ جنی ہے وہ ایک خاندان کیلئے کافی ہو جائے گی۔ تو لوگ اسی حالت میں ہوں گے کہ اللہ بھیجے گا ایک خوشگوار ہوا تو وہ لے لیگی ان لوگوں کو اپنی بغلوں کے نیچے، اور ہر مومن و مسلم کی روح پر قبضہ کرلے گی اور باقی رہ جائیں گے برے لوگ، جو علانیہ بے حیائیاں کرینگے گدھوں کی طرح، تو بس انھیں لوگوں پر قیامت آئے گی۔

نواس بن سمعان ایک خود ساختہ صحابی کی طرف یہ حدیث منسوب کی گئی ہے، اور ایک ہی سلسلۂ اسناد سے مسلم، ترمذی، ابوداؤد، اور ابن ماجہ میں مروی ہے۔ یعنی نواس بن سمعان سے صرف جبیر بن نفیر، ان سے صرف ان کے بیٹے عبدالرحمٰن بن جبیر بن نفیر، ان سے یحییٰ بن جابر الطائی، ان سے عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر، ان سے ولید بن مسلم۔ یہانتک سب کے سب متحد ہیں۔ ولید بن مسلم کے بعد فرق چلتا ہے۔ ولید بن مسلم سے زہیر بن حرب، ان سے امام مسلم۔ اور ولید بن مسلم سے علی بن حجر، ان سے ترمذی، اور ولید بن مسلم سے صفوان بن صالح الدمشقی

ان سے ابوداؤد۔ غرض مسلم، ترمذی، اور ابوداؤد، ان تینوں کے صرف شیخ الگ الگ مختلف ہیں۔ شیخ کے شیخ اور پھر ان کے اوپر کے سارے نام ایک ہی ہیں۔ لیکن ابن ماجہ ہشام بن عمار سے، اور وہ یحیٰی بن حمزہ سے اور وہ عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر سے روایت کرتے ہیں یعنی ابن ماجہ کے شیخ بھی ان مسلم و ترمذی و ابوداؤد کی طرح ایک دوسرے سے مختلف تو ہیں ہی، شیخ کے شیخ جو ان تینوں میں ایک ہی شخص ہیں یعنی ولید بن مسلم، یہاں وہ بھی بدلے ہوئے ہیں، ان کی جگہ ابن ماجہ کے شیخ الشیخ یحیٰی بن حمزہ ہیں۔ ان کے بعد پھر سارے نام متحد ہیں۔ غرض مسلم، ترمذی ابوداؤد، اور ابن ماجہ، یہ چار بڑے بڑے محدثین اس کے گواہ ہیں کہ اس حدیث کے ذمہ دار تنہا اور صرف عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر ہیں۔ اسی لئے ترمذی نے یہ حدیث نقل کر کے صاف لکھ دیا کہ "اس حدیث کو ہم نہیں جانتے بجز عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر کی حدیث ہونے کی حیثیت سے۔"

مگر باوجود اس کے یہ حدیث ایک ہی سلسلہ اسناد سے سارے محدثین کو صرف عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر ہی سے ملی۔ ہر کتاب کے متن حدیث میں دوسری کے متن حدیث سے کچھ الفاظ کا فرق یا کمی بیشی موجود ہے۔ مثلاً

<table>
<tr><th>صحیح مسلم</th><th>ترمذی</th><th>ابن ماجہ</th><th>ابوداؤد</th></tr>
<tr><td>فلما رُحنا الیہ</td><td>قال ثم انصرفنا من عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم رحنا الیہ</td><td>فلما رحنا الیہ</td><td rowspan="6">ابوداؤد میں یہ ساری عبارتیں جن میں وہ تینوں باہم مختلف ہیں موجود ہی نہیں۔ ابوداؤد کی حدیث ہی شروع ہوئی ہے وہاں سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر فرماتے ہوئے فرمایا کہ "اگر وہ نکلا اور میں تم میں موجود رہا تو میں تمہاری طرف سے اس کا مدمقابل ہونگا ۔ ۔ ۔ ۔ الخ۔ البتہ ایک اضافہ مختصر سا ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے اوائل سورۂ کہف کے بارے میں فرمایا کہ "یہ تمہارے لئے اس کے فتنے سے ایک امان ہے۔" یہ عبارت ابوداؤد کے سوا اور کسی دوسری کتاب میں نہیں ہے، یہ چند اختلافات مثالاً پیش کئے گئے ورنہ ان چاروں کتابوں میں جزئی باہمی اختلافات اور بھی ہیں۔</td></tr>
<tr><td>اخوفنی علیکم</td><td>اخوف لی علیکم</td><td>اخوفنی علیکم</td></tr>
<tr><td>کانّی اُشبّھہٗ</td><td>شبیھہٗ</td><td>کانّی اشبّھہٗ</td></tr>
<tr><td>فمن ادرکہ منکم</td><td>فمن راٰہ منکم</td><td>فمن راٰہ منکم</td></tr>
<tr><td>فاثبتوا</td><td>فالبثوا</td><td>فاثبتوا</td></tr>
<tr><td colspan="3">مسلم و ترمذی کے صرف شیخ بدلے ہوئے ہیں شیخ کے بعد سارے راوی ایک ہی ہیں اسلئے ان دونوں میں اختلاف کا ہونا تعجب خیز ہے۔ ابن ماجہ کے شیخ کے شیخ بھی دوسرے ہیں مگر تعجب ہے کہ مسلم و ابن ماجہ میں اتنا اختلاف نہیں جتنا مسلم و ترمذی میں ہے۔ واللہ اعلم بالتحقیق۔</td></tr>
</table>

خیر یہ نقشہ تو محض لفظی اختلافات کا ہے، مفہوم سب کا ایک ہی ہے۔ بعض جگہ مفہوم میں کمی تھی جس کی تکمیل کی گئی ہے جیسے پہلے اختلاف میں ہے مسلم اور ابن ماجہ میں صرف فلما رُحنا الیہ ہے۔ ترمذی نے اس کو مکمل کر دیا ہے کہ ثم انصرفنا من عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم رحنا الیہ۔ پہلے انصراف کا ذکر ضروری تھا۔ ابوسریحہ اور ان کے ساتھی تو رسول اللہ صلعم کے سامنے آپ کی باتیں سن رہے تھے اور وہاں پر موجود ہی تھے۔ پھر یہ کہنا کہ "تو جب ہم لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے" چہ معنی دارد؟ ترمذی نے اس کو صاف کر دیا کہ ابوسریحہ نے کہا کہ اتنی باتیں سن کر ہم لوگ آپ کے پاس سے چلے گئے۔ پھر جب آپ کی خدمت میں

حاضر ہوئے تو آپ نے یہ یہ فرمایا۔ اس اصلاح کی شدید ضرورت تھی۔ مگر بعض جگہ مضمون میں ایسا اختلاف ہے جس کو تضاد کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً مسلم اور ابن ماجہ میں ہے کہ دجال آئیگا تو لوگ پہلے ہی دن اس کی دعوت قبول کرلیں گے اور اس پر ایمان لے آئیں گے مگر دوسرے دن اس کی دعوت رد کردیں گے، تب وہ اپنے خرق عادت دکھائے گا اور لوگ اس کی دعوت قبول کرلیں گے اور اس پر ایمان لے آئیں گے لیکن ترمذی میں ہے کہ پہلے دن جو وہ لوگوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرے گا تو لوگ اس کو جھٹلائیں گے اور اس کی بات نہیں مانیں گے تب وہ اپنے خرق عادت دکھلائے گا۔ اور لوگوں کے دل خود بخود اس کی طرف کھچ جائیں گے۔ اور لوگ بے مال کے مفلس و قلاش ہوجائیں گے تب اس پر ایمان لے آئیں گے۔

مسلم اور ابن ماجہ میں یہ بات خلافِ عقل سی تھی کہ پہلے دن بغیر کسی خرق عادت کے دیکھے صرف دعوت پر تو لوگ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیں گے مگر جب وہ اپنے خرق عادت دکھلائے گا تو دوسرے ہی دن لوگ اس سے پھر جائیں گے اور اس کی دعوت رد کردینگے آخر یہ انقلاب لوگوں کے ذہنوں میں کیوں پیدا ہوجائے گا، اس کو بیان کرنا ضروری تھا۔ ترمذی نے اس کی بھی اصلاح کی اور اس کو یوں بنا دیا کہ لوگ پہلے دن اس کی دعوت کو رد کردیں گے مگر جب وہ خرق عادت دکھائے گا تو دوسرے دن اس کی دعوت قبول کرلیں گے۔ اور اس پر ایمان لے آئیں گے۔ غرض مسلم اور ابن ماجہ کی حدیث میں مفہوم کے اعتبار سے جو غلطیاں تھیں ترمذی نے ان کی اصلاح ضرور کی ہے۔ ترمذی کے شیخ مسلم و ابن ماجہ کے شیخ سے زیادہ نکتہ سنج آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

اسی طرح مسلم اور ابن ماجہ میں ہے کہ دجال کی دعوت جب لوگ دوسرے دن رد کردیں گے تو وہ لوگوں کے پاس سے چلا جائیگا۔ اس کے جانے کے بعد سب لوگ مفلس و قلاش ہوجائیں گے، ان کے اموال میں سے کچھ بھی ان کے قبضے میں نہ رہے گا۔ یہ نہیں بتایا کہ آخر ان کے سارے اموال ان کے پاس سے کیا ہوجائیں گے؟ ترمذی کے شیخ نے اس رکاکت کو بھی محسوس کیا اور کچھ الفاظ بڑھا کر مضمون کو درست کردیا اور لکھا کہ جب پہلے دن لوگ اس کی دعوت کو جھٹلائیں گے تو وہ ان لوگوں کے پاس سے چلا جائیگا اور اس کے جانے کے وقت لوگوں کے اموال اس کے پیچھے پیچھے کھچے چلے جائیں گے، یہاں تک کہ جب دوسرا دن ہوگا تو لوگ ایسی حالت میں صبح کریں گے کہ سب کے سب مفلس و قلاش ہوں گے۔ ان کے قبضے میں کچھ نہ ہوگا۔ اس اصلاح کے بعد لوگوں کے مفلس و قلاش ہوجانے کی وجہ ظاہر ہوگئی۔ اس اصلاحوں کی بھی اہمیت پہلی اصلاحوں سے کم نہیں ہے۔

ان اصلاحوں کے پیش نظر، یہ بات ضرور سمجھ میں آجاتی ہے کہ مسلم کی حدیث ابن ماجہ میں صرف نقل کرلی گئی۔ اور ترمذی میں دونوں کی یا صرف مسلم کی حدیث پیش نظر رکھکر، اس کے نظم عبارت و مضامین پر غور کرنے کے بعد پہلے مناسب محو و اثبات سے بقدر ضرورت کام لیا گیا۔ اس کے بعد وہ اصلاح شدہ حدیث اس میں داخل کی گئی۔ اسی لئے مسلم و ابن ماجہ میں باوجود اس کے کہ دونوں کے شیخ اور شیخ کے شیخ بھی بدلے ہوئے ہیں، صرف ایک ہی لفظ میں محض معمولی سا فرق معلوم ہوتا ہے یعنی مسلم میں فمن ادرکہ منکم ہے اور ابن ماجہ میں فمن راٰہ منکم ہے یہاں بھی ترمذی نے ان دونوں میں سے جو بلیغ لفظ تھا اسی کو اختیار کیا۔ یعنی فمن راٰہ منکم ہی لکھا۔ ایک تو یہ کہ یہ محل ضمیر مفعول کے حذف کے لئے مناسب نہیں صاف کہنا تھا فمن ادرکہ منکم۔ دوسرے یہ کہ ادرک سے مراد اس کے

خروج کا زمانہ پالینا بھی ہوسکتا ہے۔ جو یہاں مقصود نہیں۔ اور فمن رآہ منکم نہایت صاف اور واضح مفہوم کو ادا کر رہا ہے۔ اسی لئے ابن ماجہ میں اس حدیث کو داخل کرنے والے نے بھی یہاں ادرک کی جگہ رآہ بنالیا۔

مسلم کی روایت میں یہ بھی ہے کہ دجال کے مکر و فریب قتل و غارت گری سے جو لوگ بچ رہے ہوں گے، وہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کے پاس آئیں گے اور ترمذی و ابن ماجہ میں یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس خود حضرت عیسیٰؑ پہنچیں گے۔ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ

لیکن ترمذی میں ایک عجیب اضافہ اس حدیث کے اندر ہے جو مسلم میں اس حدیث کے اندر تو نہیں، مگر اس حدیث کے باہر ضرور ہے لیکن ابن ماجہ میں یہ اضافہ اس حدیث کے اندر ہے نہ باہر۔ وہ یہ کہ دجال کے آنے اور پھر حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ مبعوث ہونے، اور دجال کو قتل کرنے کے ذکر کے بعد یاجوج و ماجوج کا ذکر ہے کہ وہ قوم بیت المقدس کے پاس پہنچے گی تو اس وقت کہے گی کہ ہم لوگوں نے ان سب کو تو قتل کر دیا جو لوگ زمین پر تھے، اب آؤ ان سبھوں کو بھی قتل کر دیں جو آسمان پر ہیں۔ تو وہ اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے۔ اللہ ان کے تیروں کو اوپر سے نیچے کی طرف خون آلود واپس کریگا۔

اس مضمون کو صحیح مسلم میں زہیر بن حرب عن ولید بن مسلم عن عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر والی روایت سے الگ نئے عنعنہ سے عن علی بن حجر عن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر عن ابیہ کرکے روایت کیا ہے۔ ترمذی میں روایت ہے علی بن حجر ہی سے مگر وہ ولید بن مسلم سے روایت کرتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر کے بیٹے عبداللہ سے روایت نہیں کر رہے ہیں۔ تو اگر ولید بن مسلم نے اس مضمون کو اس حدیث میں داخل کرکے علی بن حجر سے بیان کیا تھا تو پھر انھیں ولید بن مسلم نے تو یہ حدیث زہیر بن حرب سے بیان کی تھی اور زہیر سے امام مسلم نے سنی، تو ولید بن مسلم نے اس مضمون کو زہیر بن حرب سے اس حدیث میں کیوں نہیں بیان کیا؟ اور جب سب کے سب عبدالرحمٰن بن جابر ہی سے اس حدیث کو روایت کر رہے ہیں تو ابن ماجہ اس مضمون سے کیوں خالی ہے۔ یہ گتھی ایسی ہے جس کو کوئی محدث نہیں سلجھا سکتا۔ بات یہ ہے کہ صحیح مسلم ہی میں یہ حدیث پہلے داخل کی گئی۔ اور اس مضمون کو الگ ایک حدیث کی صورت میں رکھنا ہی اسوقت مناسب معلوم ہوا۔ مگر ابن ماجہ میں جس نے داخل کیا اس نے اس مضمون کو کچھ مناسب نہیں محسوس کیا۔ اس لئے بالکل ہی اس مضمون کو اڑا پھینکا اور ترمذی میں داخل کرنے والے نے دیکھا کہ جس طرح اور مضامین اس حدیث کے ہیں اسی طرح یہ بھی تو ہے۔ پھر الگ ایک حدیث کی شکل میں کیوں رہے دونوں کو ایک کر دیا، امیر حمزہ کی داستان سے عمرو عیار کا قصہ الگ کیوں رہے۔ یہ حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں تو ہو نہیں سکتیں، امیر حمزہ کی داستان یا طلسم ہوش ربا کا ایک باب ضرور ہو سکتی ہیں۔

امام مسلم اور ترمذی نے یہ بھی لکھا ہے کہ علی بن حجر نے کہا کہ عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر کے بیٹے عبداللہ اور ان کے شاگرد ولید بن مسلم دونوں کی حدیثیں خلط ملط ہوگئیں ایک کی حدیث دوسرے کی حدیث میں داخل ہوگئی۔ تو ایسا ترمذی میں ضرور ہوا کیونکہ ترمذی میں علی بن حجر دونوں سے یعنی عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر کے بیٹے عبداللہ اور شاگرد ولید بن مسلم سے یکجائی روایت ہے، اور دونوں کی حدیثوں کو یکجائی طور سے علی بن حجر نے ترمذی سے روایت کیا ہے، اس لئے ترمذی میں دونوں کی حدیثوں کے خلط ملط ہو جانے کا امکان ضرور ہے۔ مگر مسلم میں تو ولید بن مسلم کی روایت علی بن حجر سے ہے ہی نہیں، بلکہ زہیر بن حربؒ سے ہے اور عبداللہ بن عبدالرحمٰن

بن یزید بن جابر کی حدیث الگ ہے جو علی بن حجر سے ہے تو یہاں ولید کی حدیث علی بن حجر روایت ہی نہیں کر رہے ہیں۔ اس لئے صحیح مسلم میں ولید و عبداللہ کی حدیثوں کے خلط ملط کا ذکر بالکل لایعنی ہے۔ بہرحال صحیح مسلم کے طریق روایت سے یہ بات واضح ہے کہ یہ اضافہ صرف عبداللہ کی روایت میں ہے یعنی بیٹے نے باپ کی روایت پر اتنا اضافہ کر دیا کہ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ اگر کوئی اس کو نہ سمجھے تو یہ تجاہل عارفانہ ہے۔

واضح رہے کہ بعض محدثین کا اس طرح اپنی کسی کمزوری کا اظہار کہیں اپنا شک ظاہر کر دینا کہ شیخ نے یہ لفظ کہا یا یہ لفظ، ان کی غایت دیانتداری کا ثبوت قرار دیا جاتا ہے مگر یہ ویسا ہی ہے جیسے کوئی مولانا قسم کے حضرت کسی مجلس میں آئیں اور بالکل صف نعال کے پاس اس لئے بیٹھیں کہ دیکھنے والوں میں جو جانتے پہچانتے ہیں وہ شور مچائیں کہ مولانا ادھر تشریف لائیے ادھر تشریف لائیے تاکہ جو نہیں پہچانتے ہیں وہ بھی پوچھنے لگیں کہ یہ کون بزرگ ہیں اور پھر ان کا غایت انکسار بھی ثابت ہو، حالانکہ یہ ان کے غایت استکبار کی دلیل ہے۔ غرض یہ بھی محدثین کی ایک قسم کی تدلیس ہی ہے، اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔

یہ ساری بحثیں تو مسلم، ترمذی اور ابن ماجہ کی حدیثوں کے متعلق ہوئیں۔ ابو داؤد کی حدیث کے متعلق آپ کو نقشے میں اتنا معلوم ہو چکا کہ انھوں نے حدیث کو بالکل مختصر کر دیا۔ انھوں نے خود مختصر کیا یا ان کو مختصر ملی ہی۔ وہ بیک واسطہ مسلم اور ترمذی کی طرح ولید بن مسلم ہی سے روایت کر رہے ہیں۔ ابو داؤد کے شیخ اس حدیث میں صفوان بن صالح الدمشقی ہیں۔ معلوم نہیں ولید بن مسلم نے زہیر بن حرب امام مسلم کے شیخ کو اور علی بن حجر ترمذی کے شیخ کو تو پوری حدیث سنائی، ابو داؤد کے شیخ صفوان کو کاٹ چھانٹ کر کیوں سنائی۔ ابتدائی واقعات بھی غائب اور پھر یہ اضافہ بھی غائب۔ یہ اضافہ تو عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن یزید بن جابر کی طرف سے ہے اور ان سے یہ حدیث ابو داؤد میں مروی ہی نہیں۔ نہ علی بن حجر سے مروی ہے۔ اسلئے نہ یہ اضافہ ابو داؤد میں ہے نہ اس کا اظہار کہ دونوں کی حدیثوں میں خلط ملط ہو گیا۔ اتنا تو سمجھ میں آیا۔ مگر ابتدائی باتیں جو مسلم، ترمذی اور ابن ماجہ سب میں ہیں وہ ابو داؤد میں کیوں نہیں ہیں یہ بالکل سمجھ میں نہیں آیا نہ آ سکتا ہے۔

(باقی آئندہ)

استدراک

علامہ تمنا عمادی صاحب کی اس تنقید کا تھوڑا سا حصہ اور باقی ہے جسے آئندہ اشاعت میں شائع کیا جائے گا۔ اس کے بعد قارئین کے اصرار پر انھوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ امام مہدی کے متعلق احادیث سے بھی اسی طرح بحث کریں گے۔

جیسا کہ ہم نے اس سلسلہ کی ابتدا میں لکھا تھا علامہ تمنا کو رجال اور اسناد کی تحقیق و تنقید میں بڑی وسعت نگاہ حاصل ہے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک قرآنی نقطۂ نگاہ سے اس تحقیق کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ لیکن یہ طریق ان لوگوں کیلئے مفید ہو سکتا ہے جو حدیث کو دین ماننے والوں کو خود انہی کے حربوں سے شکست دینا چاہتے ہیں۔

تمنا صاحب نے اپنی تنقید کے اس حصہ میں جو دسمبر ۱۹۵۳ء کے طلوع اسلام میں شائع ہو چکا ہے قرآن کی آیت وان من اهل الکتٰب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ ویوم القیٰمۃ یکون علیہم شہیدا کی تفسیر بھی لکھی ہے۔ ہمارے نزدیک وہ تفسیر بہت کمزور ہے۔ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ

اہل کتاب دو قسم کے ہیں۔ ایک سچے اہل کتاب جو اپنی کتابوں کی تلاوت اس طرح کرتے ہیں کہ تلاوت کا حق ادا ہو۔ اور دوسرے وہ جو اپنی کتابوں کی اس طرح تلاوت نہیں کرتے۔ اس تقسیم کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ وان من اھل الکتب سے مراد سچے اہل کتاب کے افراد ہیں۔ اور ویکون علیھم شھیدًا میں علیھم سے مراد جھوٹے اہل کتاب ہیں۔ علاوہ اور باتوں کے یہ کس طرح سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ جو یہودی اور عیسائی تورات یا انجیل کی اس طرح تلاوت کرتے ہیں جو اس کا حق ہے وہ اپنی موت سے پہلے ضرور اس حقیقت پر ایمان لے آتے ہیں کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ قتل کیا تھا نہ صلیب پر لٹکایا تھا۔ یہ ایک تاریخی سوال ہے جس کا ہم یقینی طور پر کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اسلئے قرآن کا یہ دعویٰ (اس تفسیر کی رو سے) محتاج دلیل رہ جاتا ہے۔ قرآن نے وان من اھل الکتب میں "اِنْ" نافیہ اور "اِلَّا" سے اس جملہ کو موجبہ کلیہ بنا دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تمام اہل کتاب اس پر ضرور بالضرور ایمان لائیں گے۔ ان وجوہات کی بنا پر ہمارے نزدیک اس آیت کی یہ تفسیر بہت کمزور ہے۔ (طلوع اسلام)

طلوع اسلام ہفتہ وار

نومبر کی اشاعت میں ہم نے قارئین میں سے ایک صاحب کی تحریک پر یہ تجویز پیش کی تھی کہ اگر دس ہزار روپیہ جمع ہو جائے تو طلوع اسلام کو ہفتہ وار کیا جا سکتا ہے۔ اپیل میں ہم نے لکھا تھا کہ اس میں صرف وہ حضرات حصہ لیں جو زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کی توفیق رکھتے ہوں۔ جو حضرات اپنے خلوص کی نسبت آمدنی کم رکھتے ہیں وہ اپنا پیٹ کاٹ کر اس میں حصہ نہ لیں۔ اس اپیل کے جواب میں قریباً پانچ ہزار روپے کے وعدے ان حضرات کی طرف سے موصول ہوئے جو اس کی فی الواقعہ استطاعت رکھتے ہیں لیکن باقی حضرات پھر وہی تھے جو اپنے خلوص کی گراں بہا پیشکش لیکر آگے بڑھے۔ ہم اس گرانی کے زمانہ میں ان حضرات کی پیشکش کو قبول کرنے سے معذور ہیں۔ اگر ایک ہزار یا پانچ پانچ سو روپیہ دینے والے کچھ حضرات اور آگے بڑھ سکتے ہیں تو اس تجویز کو عمل میں لایا جا سکے گا، ورنہ ہم معذور ہیں۔ جن حضرات نے دست تعاون بڑھایا ہے ہم ان کے بہ دل شکر گذار ہیں۔ لیکن ان سے روپیہ اس وقت منگایا جائے گا جب دس ہزار کے وعدے ہم تک پہنچ جائیں گے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

رفتارِ عالم

کوریا کی سیاسی کانفرنس سے متعلق عدم مصالحت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ یہ امر بھی وجہ نزاع بن گیا تھا کہ کانفرنس کی ترکیب پہلے طے کی جائے یا اس کا ایجنڈا پہلے مرتب کیا جائے۔ اس تعطل کا متفقہ حل یہ قرار پایا تھا کہ دونوں امور بیک وقت فیصل کئے جائیں۔ لیکن یہ وادی کچھ ایسی پرخار واقع ہوئی ہے کہ کسی ایک کانٹے سے چھڑاتے چھڑاتے دامن بیسیوں اور کانٹوں میں الجھ جاتا ہے۔ ایجنڈا اور ترکیب کی ترتیب سے متعلق اتفاق ہو جانے کے باوجود بات آگے نہ بڑھ سکی۔ ایک موقع پر اقوام متحدہ کے نمائندے مسٹر ڈین نے اپنی تجاویز پیش کیں جس سے پھر تعطل پیدا ہو گیا۔ مسٹر ڈین تو غالباً مذاکرات کو وہیں ختم کر دیتے لیکن امریکہ کے سکریٹری آف سٹیٹ مسٹر ڈلیز کی طرف سے انھیں ہدایت موصول ہوئی کہ مصالحت کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ یہ ہدایت اس اعتبار سے اہم تھی کہ مسٹر ڈلیز نے برمودا کانفرنس سے فارغ ہو کر اسے مسٹر ڈین کے نام بھیجا تھا۔ گویا اس سے استنباط کیا جا سکتا تھا کہ آئزن ہاور اور چرچل تک کی اسے تائید حاصل ہے۔ اس ہدایت کے موصول ہونے پر پھر تعطل کی برفانی سل کو پگھلانے کی کوشش شروع ہوئی۔ اس کوشش میں ایک دن اشتراکی نمائندے نے امریکہ پر الزام لگا دیا کہ گذشتہ جون میں جنوبی کوریا کے صدر ڈاکٹر ری نے جن اشتراکی قیدیوں کو رہا کر دیا تھا اس میں امریکہ نے بدعہدی کا ثبوت دیا۔ اس الزام پر جانبین سے الزامات کا سلسلہ شروع ہو گیا تا آنکہ مسٹر ڈین نے یہ اعلان کر دیا کہ اگر اشتراکی اس الزام کو واپس نہ لیں اور مذاکرات کے اجرا کی خواہش کا اظہار نہ کریں تو مزید مذاکرات معطل رہیں گے انھوں نے یہ بھی دھمکی دی کہ اگر اشتراکی اجرائے مذاکرات میں پہل نہیں کریں گے تو ہفتہ مختتمہ ۱۹ دسمبر تک انتظار کرنے کے بعد وہ فیصلہ کریں گے کہ ان کا آئندہ قدم کیا ہو۔

الزام تراشی اپنے تشریحی بیانات میں مسٹر ڈین نے اشتراکیوں کے گستاخانہ رویہ اور مصالحت ناپسندی کا خصوصی چرچا کیا ہے۔ اشتراکیوں نے جواب میں مسٹر ڈین پر الزام لگایا ہے کہ وہ ازرہ تخوت پسندی مذاکرات چھوڑ کر چل دیئے اور ان کی نیت صلح جوئی کی ہرگز نہیں تھی۔ انھوں نے یہ بھی الزام لگایا ہے کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح ان بیس ہزار شمالی کوریائی اور چینی قیدیوں کو اشتراکیوں کے حوالے کرنے سے بچ جائیں جو اس وقت ان کی تحویل میں ہیں۔ مذاکرات کا یہ "انسانی" پہلو بالکل عجیب ہے۔ اس وقت اقوام متحدہ کی حراست میں جو کمیونسٹ علاقے کے قیدی ہیں، ان سے متعلق کمیونسٹوں کو موقع دیا گیا ہے کہ وہ ان سے افہام و تفہیم کر لیں اور اس کے بعد اگر وہ برضا و رغبت اپنے گھروں کو واپس جانا چاہیں تو انھیں جانے دیا جائے گا ورنہ انھیں رہا کر دیا جائے گا۔ یہ افہام تفہیم کا سلسلہ بھی بڑا کٹھن ہے اور ایک پنچ ارکانی کمیشن کے تحت بہ ہزار دقت چل رہا ہے جو ہندوستانی قیادت میں کام کر رہا ہے۔ اس محاذ میں کمیونسٹوں کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی جس سے طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ یہ سلسلہ ۲۰ جنوری ۱۹۵۴ء تک چلے گا۔ اس کے بعد تمام قیدی رہا کر دیئے جائیں گے عام اس سے کہ انھیں افہام و تفہیم کا موقع ملا ہے یا نہیں۔ چنانچہ مذاکرات متذکرہ صدر میں تاخیر و التوا کا

مطلب یہ ہے کہ مقررہ تاریخ گزرنے پر بغیر کسی تصفیہ کے ان قیدیوں کو جنوبی کوریا میں چھوڑ دیا جائیگا۔ کمیونسٹوں کے لئے یہ اہم شکست ہے۔

محاذ کوریا پر اس تعطل کے باوجود بساطِ عالم پر امن کی کوششیں برابر جاری ہیں۔ اس ضمن میں اہم ترین واقعہ برمودا کانفرنس کا انعقاد ہے۔ چرچل قائدین عظام عالم کے جن مذاکرات پر کئی ماہ سے زور دیتے چلے آرہے ہیں، برمودا کانفرنس ان کی تمہید ہے، گو یہ تمہید چرچل کی حسب خواہش ثابت نہیں ہوئی۔ قرائن و آثار سے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ برمودا میں امریکہ کی فتح ہوئی ہے اور چرچل کو اپنے مطالبے سے پیچھے ہٹنا پڑا ہے۔ کانفرنس کے خاتمہ پر جو یادداشت شائع کی گئی ہے اس میں اس امر پر خصوصی زور دیا گیا ہے کہ امن عالم کی بہترین ضمانت مشترکہ طاقت اور تنظیم میں ہے۔ جس سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ امریکہ اپنی طاقت کو روس سے برتر سمجھتا ہے اور اس سے جھک کر صلح کرنے کیلئے تیار نہیں۔

قریب مفاہمت

برمودا میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ جرمنی اور آسٹریا کے معاہدات امن کے لئے روس نے جو آخری پیشکش کی ہے، اسے منظور کر لیا جائے۔ روس کی تجویز یہ تھی کہ دول اربعہ کے وزرائے خارجہ برلن میں ملاقات کریں اور متعلقہ معاملات طے کریں۔ یہ فیصلہ مغربی جرمنی کے صدر ڈاکٹر ایڈی ناور سے استصواب کرنے کے بعد کیا گیا ہے۔ گو ہنوز یہ تصفیہ طلب ہے کہ مجوزہ کانفرنس مغربی برلن میں ہو یا مشرقی برلن میں، تاہم توقع کی جاسکتی ہے کہ اس کا انعقاد ۲۵ جنوری ۱۹۵۴ء کو ہو جائے گا۔ اس انعقاد سے متنازعہ امور طے ہو سکیں گے یا نہیں، اس کے متعلق پرانے تجربات کی روشنی میں چنداں توقعات وابستہ نہیں کی جاسکتیں۔ روس نے برلن کانفرنس کی دعوت دیکر بظاہر اپنے موقف کو چھوڑا ہے وہ اس سے پیشتر اس پر مصر تھا کہ مذاکرات مصالحت عمومی میں ایک تو اشتراکی چین کو شامل کیا جائے، دوسرے مغربی یورپ کے دفاعی منصوبہ (E.D.C.) اور شمالی اوقیانوس کی معاہدہ جمعیت (N.A.T.O.) کو ختم کر دیا جائے۔ مغربی یورپ کا دفاعی منصوبہ فرانس اور جرمنی کی تاریخی کشمکش کے طفیل تصدیق طلب ہے۔ فرانسیسی حکومت ابتک اس کی تصدیق اسلئے نہیں کر سکی کہ اس کے حق میں مطلوبہ اکثریت حاصل نہیں ہو سکی، اور مطلوبہ اکثریت حاصل اس لئے نہیں ہو سکتی کہ فرانس کو ڈر ہے کہ اس منصوبہ بندی میں جرمنی شریک ہو کر از سر نو مسلح ہو جائے گا جس سے اس کی ہستی معرض خطر میں پڑ جائے گی۔ اندریں حالات فرانس اس کی تصدیق کو التوا میں ڈالے چلا آرہا ہے اور اس امید اور کوشش میں ہے کہ روس سے کوئی مفاہمت ہو جائے تاکہ جرمنی کی اسلحہ بندی کا کوئی تدارک ہو سکے۔ ضمناً اب امریکہ نے دھمکی دی ہے کہ اگر اس نے متحدہ یورپ کے معاہدہ کی توثیق نہ کر دی تو امریکہ مزید مدد روک دیگا۔ فرانس میں اس الٹی میٹم پر کافی اضطراب کا مظاہرہ کیا جارہا ہے۔ روس فرانس کی اس کمزوری کو سمجھتا ہے اور اسے مفید مطلب بنا رہا ہے۔ اس کی چال یہ ہے کہ مفاہمت کی امید دلا کر مذکورہ منصوبہ کی تصدیق کو معرض التوا میں ڈال دے۔ برلن کانفرنس کا بظاہر مفاہمت پسندانہ قدم اسی لئے اٹھایا گیا ہے۔ اس پس منظر میں یہ بھی توقع کی جاسکتی ہے کہ کانفرنس میں روس اپنا رویہ سخت رکھنے کی بجائے نرم رکھے اور ایسی توقعات پیدا کرتا جائے جس سے مستقل حل تو نہ نکلے لیکن فرانس کی آس نہ ٹوٹے اور وہ فریب مفاہمت میں مبتلا رہ کر (E.D.C.) کی تصدیق کو ٹالتا جائے۔

امن عالم کی ضمانت

یہ بات متضاد سی معلوم ہوتی ہے لیکن امن کی ضمانت ایٹمی اسلحہ میں نظر آتی ہے۔ امریکہ اور روس نے ان خوفناک و تباہ کن اسلحہ کا اس قدر ذخیرہ جمع کر لیا ہے کہ دونوں ہراساں ہیں کہ اگر جنگ شروع ہو گئی تو ان کا اپنا کیا حشر ہوگا۔ اس سے پہلے امریکہ روس کو یہ دھمکی دیا کرتا تھا کہ اگر اس نے جنگ شروع کی تو اسے تباہ و برباد کر دیا جائے گا لیکن اب جبکہ

روس کے پاس بھی ایٹم بم موجود ہیں تو امریکہ کی روش میں تبدیلی آگئی ہے۔ دونوں ممالک ان اسلحہ کو ممنوع قرار دینا چاہتے ہیں لیکن کوئی متفقہ طریقہ حصول مقصد کا تجویز نہیں ہو سکا۔ روس کا مطالبہ ہے کہ ایسے تمام اسلحہ کو ضائع کر دیا جائے اور دیگر اسلحہ میں ایک تہائی کی تخفیف کی جائے۔ امریکہ اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کا کہنا ہے کہ پہلے یہ تحقیق کی جائے کہ ہر ملک کے پاس کس قدر اٹیمی اور غیر اٹیمی اسلحہ ہیں اور پھر ان کے ضیاع و تخفیف کی بات چیت کی جائے۔ روس ڈرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ امریکہ اس کا رازداں جائے اور اپنی برتری دیکھ کر مذاکرات ختم کر کے لڑائی شروع کر دے۔ امریکہ بغیر حقیقت حال جانے اٹیمی اسلحہ اس لئے ضائع کرنا نہیں چاہتا کہ روس کی پوزیشن اس کے مقابلہ میں کچھ بھی ہو بہرحال یہ حربے اس کے پاس موجود تو ہیں جو بوقت جنگ استعمال میں لائے جا سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ اقوام متحدہ کے ذریعے طے ہو رہا ہے لیکن کچھ بات بنتی نظر نہیں آتی۔ نومبر کے تیسرے ہفتے میں جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد میں تخفیف اسلحہ کے کمیشن کی یہ سفارش منظور کی کہ اٹیمی اور غیر اٹیمی اسلحہ کی تخفیف کے سلسلہ میں متعلقہ اقوام نجی طور پر گفتگو کریں۔ یہ صریحاً اقوام متحدہ کا اعتراف عجز ہے۔

اس معاملہ کو صدر آئزن ہاور نے ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ برمودا کانفرنس سے فارغ ہوتے ہی انھوں نے جنرل اسمبلی سے خطاب کیا۔ یہ خطاب بقول ان کے "نئی اٹیمی جنگ کے الفاظ" میں تھا۔ انھوں نے کہا کہ اٹیمی بم اب پہلے سے پچیس گنا زیادہ طاقتور ہو چکے ہیں۔ ان کے ذخیروں میں ہر سال اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان کی موجودہ تعداد ان تمام بموں اور تمام کارتوسوں سے زیادہ ہے جو دوسری جنگ عالمگیر کے دوران میں دنیا کے کسی حصے میں کسی ہوائی جہاز سے گرائے گئے یا کسی بندوق یا توپ کے دہانے سے خارج ہوئے۔ ان حالات میں، انھوں نے کہا، کہ یا تو دنیا دونوں اٹیمی ممالک کے تصادم کے خوف سے ترساں اور لرزاں رہے یا یہ سمجھ کے دم بخود ہو جائے کہ اب تہذیب انسانی کا خاتمہ ہو کر رہے گا۔ اس کے بعد انھوں نے اقوام متحدہ کی نجی گفتگو والی قرارداد کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ امریکہ تیار ہے کہ وہ روس اور مغربی اتحادیوں سے مل کر اقوام متحدہ کی خواہش پوری کرے۔ اس ضمن میں انھوں نے یہ نئی تجویز پیش کی کہ گفتگو محض تخفیف تک محدود نہیں ہونی چاہئے بلکہ ایسی صورت اختیار کرنی چاہئے کہ اٹیمی توانائی انسانیت کی بہبود و فلاح کیلئے استعمال کی جا سکے۔ یہ مقصد یوں پورا ہو سکتا ہے کہ اقوام متحدہ کے تحت اٹیمی توانائی کی تنظیم کیلئے ایک ادارہ قائم کیا جائے تاکہ تمام متعلقہ اقوام ایٹم سے متعلق مواد اس کے سپرد کر دیں اور پھر وہ اس توانائی کو دنیا بھر کی ضرورت کے مطابق استعمال میں لائے۔ یہ تجویز اس اعتبار سے اہم ہے کہ امریکہ نے پہلی مرتبہ اٹیمی توانائی کے راز میں دیگر اقوام کو شریک کرنے کی خواہش کا اظہار کیا حالانکہ ابتک وہ اس کا سختی سے مخالف رہا کہ اس راز کو افشا کیا جائے۔ روس کا فوری عمل مایوس کن ہے۔ مسٹر وائی شنسکی نے اس تقریر کے بعد جنرل اسمبلی میں کہا کہ جب تک اٹیمی اوزاروں کو ضائع نہیں کر دیا جائے گا اٹیمی توانائی کا غیر جنگی استعمال ممکن نہیں ہوگا۔ ماسکو ریڈیو نے اس تقریر کو اٹیمی جنگ کی دھمکی قرار دیا۔ بعد کی اطلاعات سے البتہ اندازہ ہوتا ہے کہ روس اس تجویز کو بالکل مسترد نہیں کر دیگا بلکہ اس پر مناسب غور کرے گا۔

جنگ اور صلح

ان مذاکرات مفاہمت کے ساتھ ساتھ یہ خبر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اور اپنی جگہ خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ کہ فرانس نے ویٹ منہ سے گفتگوئے مصالحت کی پیش کش کی ہے۔ نومبر کے چوتھے ہفتے میں پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے فرانس کے وزیر اعظم نے ہند چینی کی وطن پرست فوجوں ـــ ویٹ منہ ـــ کو جو ڈاکٹر ہوچی منھ کی قیادت میں مصروف پیکار ہیں، یہ دعوت دی کہ وہ التوائے جنگ کیلئے معقول تجاویز پیش کریں۔ یہ دعوت فرانس کی امن پسندی کی اتنی آئینہ دار نہیں جتنی اس کمزوری کی مظہر ہے جو اس کے نظم سیاسی و معاشی میں ہند چینی اور شمالی افریقہ کی جنگوں سے

واقع ہوگئی ہے۔ فرانس کیلئے سب سے بڑا مسئلہ یورپ میں جرمنی کے مقابلہ میں اپنے آپ کو قائم و برقرار رکھنے کا ہے۔ لیکن ان جنگوں نے اس کا ایسا کچومر نکال دیا ہے کہ وہ یورپ میں اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہا۔ اس لئے اس کی انتہائی خواہش ہے کہ وہ کم از کم ہند چینی کی جنگ سے فارغ ہو جائے۔ اس کا ڈاکٹر ہوچی منھ کو شرائط صلح پیش کرنے کی دعوت دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے ہند چینی کا نمائندہ سمجھتا ہے۔ یہ صورت حال اس لحاظ سے عجیب ہے کہ روس، چین اور دیگر اشتراکی ممالک نے ہوچی منھ کی حکومت کو ہی ہند چینی کی حقیقی حکومت سمجھ کر تسلیم کر رکھا ہے، کیا اب فرانس بھی اس "باغی" حکومت کو جو بہر حال ایک حصۂ ملک پر قابض ہے تسلیم کر رہا ہے؟ ہوچی منھ نے بھی جواباً صلح کی گفتگو پر رضامندی کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اس نے کہا ہے کہ کسی تیسری طاقت کو اس میں دخیل نہیں ہونے دیا جائے گا۔

اس جنگ کا خاتمہ اتنا سہل نظر نہیں آتا۔ فرانس تنہا اس کو ختم نہیں کر سکے گا کیونکہ مغربی اقوام کے نقطۂ نظر سے اس جنگ کا خاتمہ اشتراکیت کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے مترادف ہوگا۔ اگر فرانس اور ویٹ منھ میں کسی شرط پر بھی سمجھوتہ ہو گیا تو اشتراکیت کے قدم ہند چینی میں مضبوط ہو جائیں گے اور اس سے سارا جنوب مشرقی ایشیا معرض خطر میں پڑ جائیگا۔ ویسے بظاہر ایسی توقع ہی عبث ہے کہ فرانس کی یہ تجویز مصالحت میں منتج ہوگی۔ برمودا کانفرنس میں اس پر غور و خوض ہوا ہے اور جو یادداشت شائع ہوئی ہے اس میں صاف طور پر مذکور ہے کہ اعاظم ثلاثہ نے یہ عہد کر لیا ہے کہ وہ ہند چینی کی جنگ میں فرانس کو زیادہ مدد دیں گے۔ گو اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ مدد کی نوعیت کیا ہوگی لیکن قیاس یہی ہے کہ ہند چینی کی جنگ کو یونہی ختم نہیں کر دیا جائے گا۔ بظاہر زیادہ مدد کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ امریکہ براہ راست اس جنگ میں شریک ہو جائے۔ کیونکہ ابتک اس نے جو بالواسطہ مدد فرانس کو یورپ میں دی ہے وہ ہند چینی میں خرچ ہوتی رہی لیکن خاطر خواہ نتیجہ پیدا نہیں کر سکی۔ فرانس اب بالواسطہ مدد کا قائل نہیں رہا۔ لیکن اگر امریکہ براہ راست مدد دے یا خود شریک جنگ ہو جائے تو ہند چینی دوسرا کوریا بن جائے گا۔ غالباً یہ خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔

استعماریت کا سنبھالا

براعظم افریقہ، کہ تاریخ کے دھارے ابھی تک بمشکل اس کے سواحل کو چھو سکے ہیں، رفتہ رفتہ تاریخ کی پوری روشنی میں آ رہا ہے۔ اندرون افریقہ استعماری قوتیں جس انداز سے مصروف استیلا و استبداد رہی ہیں اور ہیں وہ سیاہ فام باشندوں کی طرح تاریکی کے پردے میں پنہاں ہے۔ لیکن ان تاریکیوں کی تہیں تاریخ کا ایک روشن باب ابھر رہا ہے۔ یہ باب خون و آتش سے لکھا جا رہا ہے۔ افریقہ استعماریت کی فیصلہ کن جنگ کا محاذ بن چکا ہے اور اب یہ کام کسی مورخ کا نہیں رہا کہ وہ کسی آئندہ موقع پر یہ رائے قائم کرے کہ استعماریت کا یہ آخری سنبھالا ہے۔ اس خونیں ڈرامے کا شیطانی ہیرو برطانیہ ہے۔ گذشتہ جنگ عالمگیر کے بعد کے بدلے ہوئے حالات سیاسی کے پیش نظر اس نے افریقہ میں ایک نئی "سلطنت" تعمیر کرنے کا عزم کیا ہے۔ اس سلطنت کی اساس حکمرانی کے فرسودہ تصورات پر استوار نہیں ہوگی بلکہ اس کی بنیادوں میں "دولت مشترکہ" کا سیسہ پلایا جا رہا ہے۔ اس وقت سارے کا سارا براعظم ہیجان و خلفشار کے دور سے گزر رہا ہے۔ دسمبر کے اوائل میں یوگنڈا میں ایک زلزلہ آیا۔ اس کے بادشاہ (کباکا) کو برطانوی گورنر کو ہن نے بلا کر یہ امرانہ حکم دیا کہ وہ سلطنت چھوڑ کر چلے جائیں اور عمر بھر کیلئے جلاوطن رہیں۔ انھیں افراتفری میں تیار کر کے ایک برطانوی ہوائی جہاز پر لاد کے لندن بھیج دیا گیا۔ ان پر الزام یہ ہے کہ وہ برطانوی فیصلے ماننے سے عمداً گریز کرتے رہے۔ ۱۹۱۰ء کے معاہدہ کی رو سے انھیں ملکہ معظمہ کی حکومت سے پورا پورا "تعاون" کرنا چاہیئے تھا، لیکن انھوں نے یوگنڈا قبائلیوں کے لئے آزادی کی تاریخ متعین کرنے کا مطالبہ کیا اور اصرار کیا کہ ان کے امور وزارت نوآبادیات سے نکال کر وزارت خارجہ کے سپرد کر دیئے جائیں۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ افریقہ میں حب الوطنی کا جذبہ کس سرعت سے پھیل رہا ہے۔ یوگنڈا کے مشرق میں کینیا کوئی سوا سال سے خون و آتش کا کھیل کھیل رہا ہے۔ برطانیہ نے استبداد و ظلم کے تمام حربے آزما کر دیکھ لئے لیکن یہ کھیل تھما تھا نہ تھما۔ ہوائی جہاز اور بے تحاشا بمباری بھی ناکام ثابت ہو رہی ہے۔ اس کے جنوب میں برطانیہ وسطی افریقی وفاق قائم کر رہا ہے۔ یہ ٹانگانیکا، نیاسالینڈ اور روڈیشیا پر مشتمل ہوگا۔ برطانیہ کے عزائم کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ لندن میں اس وفاق کا فیصلہ کرنے کیلئے جو کانفرنس برطانوی حکومت نے طلب کی تھی اس میں سیاہ آبادی کا ایک بھی نمائندہ مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اس پس منظر میں جو نظم سیاسی مسلط ہوگا اس کی کامیابی ناممکن ہے۔ اور جنوب میں دیکھئے تو جنوبی افریقہ میں ڈاکٹر ملن برطانیہ کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کی سیاست کا نقطہ ماسکہ نسل و رنگ ہیں لیکن یہ علاقہ دولت مشترکہ سے نکلتا نظر آتا ہے۔

وادی نیل کا معرکہ یوگنڈا کے شمال میں بھی حالات کا رخ برطانیہ کے صریح خلاف ہے۔ برطانیہ نے سوڈان میں جس دستور نو کے نفاذ کا اعلان کیا تھا۔ اس کے مطابق انتخابات ختم ہو گئے ہیں۔ برطانیہ نے اس دوران میں ہزار جتن کئے کہ اس کے پٹھو انتخاب جیت جائیں لیکن اسے خائب و خاسر ہونا پڑا۔ مصر نے حقائق و شواہد پیش کر کر کے دنیا کو بتایا کہ برطانیہ انتخاب جیتنے کے لئے کن کن حربوں سے کام لے رہا ہے۔ ایک مرتبہ تو مصر نے یہاں تک احتجاجاً کہہ دیا کہ اگر برطانیہ مداخلت سے باز نہ آیا تو انتخابات کو روک دینا پڑیگا۔ بہرحال انتخابات اختتام پذیر ہوئے۔ برطانیہ کو جنوبی سوڈان کے قبائلیوں پر بہت بھروسہ تھا۔ ایک تو اس لئے کہ وہ بہت پسماندہ ہیں، دوسرے ان میں غیر مسلم آبادی بھی ہے۔ لیکن انھوں نے کثرت رائے سے نیشنل یونینسٹ پارٹی کو کامیاب بنایا جو مصر سے الحاق کے حق میں ہے۔ انگریز مہدی سوڈانی مرحوم کے لڑکے عبدالرحمٰن اور اس کی امت پارٹی کا خصوصی ڈھنڈورہ پیٹتا رہا تھا۔ کیونکہ وہ مصر سے الحاق کے خلاف تھی اور "آزادی" کی دعویدار تھی۔ لیکن اس پارٹی کا بھی بھرم کھل گیا۔ اب سوڈان کے ایوان نمائندگان میں نیشنل یونینسٹ کی تعداد ۹۴ ہے، امت پارٹی کی ۲۹ اور آزاد ارکان کی ۱۴۔ ظاہر ہے کہ نئی سوڈانی حکومت نیشنل یونینسٹ قیادت میں ہی بنے گی اور جب یہ حکومت سوڈان کے مستقبل کا فیصلہ کریگی تو وہ مصر کے حق میں ہوگا۔ گویا افریقہ کا ایک اور خطہ برطانیہ کے چنگل سے نکلنے کے لئے تیار ہو گیا ہے۔

نہر سویز کا مسئلہ ابھی تک کھٹائی میں پڑا ہے۔ برطانوی مصری مذاکرات جو اکتوبر کے آخر میں منقطع ہوئے تھے ابھی تک شروع نہیں ہو سکے۔ برطانوی سفیر متعینہ قاہرہ، سر رلف سٹیونسن، جو یہ سلسلۂ علالت چھٹی پر تھا اپنی دنوں قاہرہ پہنچ رہا ہے۔ قیاس کیا جا رہا ہے کہ اس کی آمد پر مذاکرات از سر نو شروع ہو جائیں گے۔ برطانیہ کے رویے میں بظاہر کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ چرچل نے پارلیمان میں تازہ بیان میں کہا ہے کہ انھوں نے برمودا میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ ہماری روش میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے کہا کہ وہ انخلا سویز کی بنا پر مصر سے مفاہمت کیلئے تیار ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، ایسا تو برطانیہ کی طرف سے ہمیشہ ہی کہا جاتا رہا ہے۔ اسکے باوجود وہ آج تک سویز کو خالی کرنے پر تیار نہیں ہوا۔ برطانیہ کی عدم مفاہمت سے مصر میں ایک نئی تحریک پیدا ہوتی نظر آتی ہے۔ اس تحریک کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ افریقہ کی تمام تحریکات وطنی کو مرکوز کیا جائے اور اس کا مرکز قاہرہ ہو۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ عرب اور ایشیائی اقوام کو متحد کر کے ایک تیسری قوت پیدا کی جائے جو عالمی سیاست میں توازن برقرار رکھے۔ ایک بین الافریقی جمعیت کا معرض وجود میں آجانا چنداں بعید از قیاس نہیں کیونکہ جو ممالک متفرقہ آزادی کی جنگیں لڑ رہے ہیں وہ ایک متحدہ محاذ قائم کر لیں تو یقیناً مقصد کے حصول میں جلدی کامیاب ہوں گے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کو ہوس قیادت کا ذریعہ بنا لیا جائیگا۔ ہندوستان اس تحریک

میں خصوصیت سے دلچسپی لے رہا ہے۔ پنڈت نہرو ذاتی طور پر قیادت ایشیا کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ مشرق بعید و مشرق وسطیٰ پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالتے ہیں اور کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے کہ یہ ممالک ان کے مطیع و فرمانبردار بن جائیں۔ جنرل نجیب کو اس معاملہ میں محتاط ہونا پڑیگا۔ کیونکہ افریقی آزادی خواہوں کو انھیں اپنا قائد تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں ہوگا لیکن اگر وہ ہندوستان کی ہوس اقتدار کا شکار ہو گئے تو ایک آقا کے چنگل سے نکل کر وہ اس نئے آقا کے قابو میں آجائیں گے۔ کوئی آزادی پسند ایسا سودا کرنے کیلئے تیار نہیں ہوگا۔

تیل کا تصفیہ

ایران کی نئی حکومت نے بالآخر برطانوی حکومت سے سیاسی تعلق از سر نو استوار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ استواری چودہ مہینوں کے انقطاع تعلق کے بعد عمل میں آرہی ہے۔ جنرل زاہدی کے برسر اقتدار آتے ہی یہ قیاس آرائیاں شروع ہو گئی تھیں کہ اب برطانیہ سے دوستی پھر سے پیدا ہو جائے گی اور گو ابتداءً نئی ایرانی حکومت کا موقف یہ معلوم ہوتا تھا کہ تیل سے متعلق کوئی مفاہمت ہو لے تو سیاسی روابط شروع کئے جائیں لیکن یہ روش اب بدل گئی ہے۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ امریکہ کی طرف سے جو معاشی مدد اسوقت ایران کو مل رہی ہے اسکی میعاد آئندہ مارچ میں ختم ہو رہی ہے اور امریکہ نے ایران سے کہدیا ہے کہ اسکے بعد وہ اپنی مدد آپ کرے۔ اندریں حالات ایران کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا سوائے اسکے کہ تیل کے کارخانوں کو جو جولائی ۱۹۵۱ء سے بند پڑے ہیں پھر سے چلانے کی سبیل پیدا کرے تاکہ آمدنی کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ گویا برطانیہ سے تعلقات کی استواری میں امریکہ کا نمایاں ہاتھ ہے۔ اب توقع کی جاسکتی ہے کہ تیل سے متعلق مذاکرات شروع ہو جائیں گے لیکن کوئی تصفیہ ہو سکے گا یا نہیں اسکے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر امریکہ واقعی اس مسئلہ پر دلچسپی لے تو وہ یقیناً اس قضیہ کو حل کر سکتا ہے۔ اسوقت تیل کا معاملہ قریباً امریکہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ صدر آئزن ہاور کا نمائندہ ہربرٹ ہوور ایران کا دورہ کر کے حالات کا مطالعہ اور ارباب حل وعقد سے گفتگو کر چکا ہے۔ قیاس یہ ہے کہ امریکہ نے اس مسئلہ کا کوئی حل تجویز کر لیا ہے۔ اگر ہے تو کیا اس کا اندازہ برطانیہ اور ایران کے روابط قائم ہو جانے کے بعد ہی ہو سکے گا۔

ہندوستان کا پیچ و تاب

ہندوستان کوئی سال بھر سے یہ پروپیگنڈا کر رہا ہے کہ پاکستان امریکہ کے دفاعی منصوبے میں شریک ہو جائیگا۔ اس سال کے آغاز میں تو اس نے یہ کہہ کر آسمان سر پر اٹھا لیا کہ مغربی دول اربعہ نے مشرق وسطیٰ کیلئے جو دفاعی تجویز (M.E.D.O.) تیار کی ہے پاکستان اس میں شامل ہو رہا ہے۔ اسکے ساتھ ہی اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ اس سے ہندوستان کیلئے جنگ کا خطرہ قریب تر ہو جائے گا، کیونکہ اسکی دلیل کے مطابق، پاکستان امریکہ کے جنگی منصوبے میں شامل ہو کر فریق جنگ ہو جائیگا اور جنگ پاکستان تک پہنچے گی تو لامحالہ اس کا اثر ہندوستان پر پڑیگا۔ یہ پروپیگنڈا مختلف حیثیتوں سے جاری رہا تا آنکہ "میڈو" کا معاملہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ہندوستان نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان امریکہ کو فوجی اڈے دے رہا ہے جس سے نہ محض پاکستان کی آزادی سلب ہو جائیگی بلکہ اس سے ہندوستان کا امن بھی خطرے میں پڑ جائیگا۔ یہ غوغا آرائی اور زیادہ ہو گئی جب پچھلے دنوں پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد صاحب یورپ اور امریکہ گئے۔ انھوں نے صدر آئزن ہاور سے بھی ملاقات کی۔ اس پر ہندوستان میں طوفان مچ گیا۔ اس کے نمایندوں نے دوسرے ممالک میں بھی کافی شور مچایا۔ گو ہمارے گورنر جنرل اور امریکہ کے ذمہ دار نمایندوں نے بھی اس کی تردید کی لیکن ہندوستان خاموش نہ ہوا۔ بالآخر جب امریکہ کے وائس پریذیڈنٹ مسٹر نکسن مشرقی ممالک کے دورہ پر ہندوستان پہنچے تو ہندوستان کیلئے آب از سر گذشت و الا معاملہ ہو گیا۔ ہندوستان کے بعد مسٹر نکسن براستہ افغانستان پاکستان آئے۔ یہاں آنے سے پہلے وہ سترہ ممالک کا دورہ کر چکے تھے لیکن کسی اور ملک میں ان کے جانے کا اتنا چرچا نہیں ہوا جتنا ان کے پاکستان آنے کا۔ اور یہ سب کچھ تنہا ہندوستان نے کیا۔

یہ سمجھنا چنداں دشوار نہیں کہ آخر ہندوستان اسقدر وقف التہاب کیوں ہے۔ ہندو ابھی تک "تقسیم ہند" کو قبول یا برداشت نہیں کر سکا۔ وہ برداشت کر بھی نہیں سکتا کیونکہ اسکے نزدیک تقسیم ہند گئو ماتا کی تقسیم کے مترادف ہے۔ ہندوستان کے پہلے ہائی کمشنر متعینہ پاکستان نے تقسیم کو ہندوؤں کا "روحانی مسئلہ" قرار دیا تھا۔ انہی دنوں ہندوستان کے مشہور اخبار "سٹیٹسمین" کے سابق ایڈیٹر مسٹر سٹیفنز نے کراچی میں ایک بیان میں کہا کہ ہندوستان تقسیم کو قبول نہیں کر سکا اور نہ وہ تسلیم کر سکا ہے کہ پاکستان کو آزادانہ راہِ عمل اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ مسٹر سٹیفنز کی یہ رائے اسلئے وقیع ہے کہ وہ برسوں ہندوستان میں رہ کر ہندوستان کے مزاج و ذہنیت کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ یہی چیز آزاد ہندوستان کی اندرونی اور خارجہ پالیسی کا عمودی نقطہ ہے۔ وہ ہر جائز و ناجائز ذرائع سے پاکستان کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ تقسیم کے وقت مسلمانوں کا جو بہیمانہ گیر اور بے دریغ قتل عام ہوا، وہ اسی مکروہ ذہنیت کا مظہر تھا۔ ہندوستان پاکستان کو مفلوک و تباہ حال مہاجرین کے سیلاب میں غرق کر دینا چاہتا تھا۔ پاکستان یہ صدمۂ جانکاہ برداشت کر گیا۔ اس کے بعد تقسیم املاک کا سوال آیا، ان میں خصوصیت سے اہم فوجی ساز و سامان تھا جو سارے کا سارا ہندوستانی علاقوں میں ہندوستان کی تحویل میں تھا۔ ہندوستان نے بہ لطائف الحیل اسے روکا چنانچہ وہ آجتک نہیں مل سکا۔ یہ کوشش پاکستان کو فوجی لحاظ سے کمزور و بے دست و پا بنا دینے کی تھی۔ پاکستان نے اس کمی کو بھی پورا کر لیا۔ پھر ہندوستان نے مغربی پاکستان سے تمام ہندوؤں اور سکھوں کو نکال لیا تاکہ ان کے اخراج سے پاکستان کے انتظامی، معاشی اور کاروباری شعبوں میں ایسا خلاء پیدا ہو جائے کہ اس نئے ملک کا نظام چل ہی نہ سکے۔ یہ اقدام پاکستان کیلئے آیۂ رحمت ثابت ہوا کیونکہ تمام راستے مسلمانوں کیلئے کشادہ ہو گئے۔ اس کے بعد پاکستان کے مالی حصہ کی ادائیگی کا سوال آیا تو اسے بھی ہندوستان نے روکا۔ اسوقت عام طور پر کہا جاتا تھا کہ پاکستان کا سرکاری خزانہ اس حد تک خالی ہو چکا ہے کہ ملازمین کو تنخواہیں بھی شاید ہندی جا سکیں۔ یہ وقت بھی ٹل گیا۔ ہندوستان اپنی مسموم ذہنیت کا بدستور مظاہرہ کرتا گیا۔ اس نے جوناگڑھ، مناوادر اور منگرول کی ریاستوں پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا حالانکہ انھوں نے پاکستان سے الحاق کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ اقدام پاکستان کے علاقہ پر صریح حملہ تھا اور جنگ کے مترادف تھا چنانچہ یہ علاقے آجتک ہندوستان کے قبضے میں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان نے کشمیر پر قبضہ کر لیا اور خونریز جنگ کی طرح ڈالدی۔ کشمیر پر قابض ہو کر اس نے دریاؤں کے پانی کو اپنے قبضہ میں رکھنا شروع کر دیا اور متعدد مرتبہ پنجاب کی نہروں کا پانی بند ہو گیا جس کا فصل کی کاشت پر گہرا اثر پڑا۔ کشمیر کے قبضے سے پاکستان کو محصور کیا جا رہا ہے۔ گذشتہ چھ سالوں میں ہندوستان نے بارہا ایسا کیا ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر اپنی فوجیں پاکستانی سرحدوں پر جمع کر دی ہیں۔ کوئی پرامن ہمسایہ ایسا کبھی نہیں کرتا۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ پاکستان ہندوستان کیلئے تر نوالہ ثابت نہیں ہوا، لیکن ہندوستان نے اسے ہڑپ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اس دوران میں جتنے معاہدے ہندوستان نے پاکستان کے ساتھ کئے، ان پر وہ اس حد تک کاربند ہوا جس حد تک کہ وہ ان سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اقلیتوں کے متعلق معاہدہ اپریل ۱۹۵۰ء میں ہوا لیکن آجتک مسلمان اقلیتیں اطمینان سے وہاں رہ نہیں سکیں۔ مسلمان برستور پاکستان کی طرف ہجرت کر رہے ہیں بلکہ ان کو گھروں سے نکالا جا رہا ہے۔ اب ان کو قتل کرنے کی بجائے شدھ کیا جا رہا ہے۔ گویا اس طرح مسلمانوں کا وجود ختم کیا جا رہا ہے۔ یہ سب محض اسلئے ہو رہا ہے کہ ان مسلمانوں نے پاکستان بنوایا تھا۔

خارجہ حکمت عملی ہندوستان کی سیاست کا یہ ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ بین الاقوامی سیاست میں اپنی قیادت کا راستہ صاف کر رہا ہے اور پاکستان کو بے یار و مددگار بنا رہا ہے۔ پنڈت نہرو خصوصیت سے قیادت ایشیا کے خواب دیکھ رہے ہیں اور اس قیادت کے زور پر وہ دول عظمیٰ کے درمیان ثالث بن کر اپنا سکہ جمانا چاہتے ہیں۔ پاکستان ان کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ ایک اسلئے کہ وہ یہ قیادت تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں، دوسرے وہ مسلمان ہونے کے اعتبار سے مشرق وسطیٰ کیلئے ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ دلکشی رکھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جنوبی مشرقی ایشیا میں بھی وہ ہندوستان کا خواب قیادت پریشان کر سکتا ہے کیونکہ ان

علاقوں میں بھی مسلمان کافی آباد ہیں۔ ہندوستان کی قیادت کیلئے دوسرا خطرہ چین نے مہیا کیا۔ چین نہ محض خود نئے ولولہ عمل کے ساتھ ابھرا ہے بلکہ وہ ہندوستان کی سرحدوں تک پہنچ چکا ہے۔ ہندوستان اس کے عروج کو اطمینان سے نہیں دیکھ سکتا۔ اسکے عروج کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ اس سے کمیونزم کو تقویت پہنچے گی اور کمیونزم ہندوستان کیلئے داخلی طور پر خطرے کا باعث ہے لیکن ہندوستان چین سے بگاڑ بھی نہیں سکتا کیونکہ کمیونزم کی طاقت سے ٹکر لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اندریں حالات ہندوستان نے "غیر جانبداری" کا ڈھونگ رچایا۔ "غیر جانبداری" دو دھاری تلوار ہے۔ پنڈت نہرو بظاہر چین اور روس سے ہمدردی کا دم بھرتے ہیں تاکہ یہ سیلاب رکا رہے اور وہ بھی ان کی خوشامدیں اور تعریفیں کرتے رہیں لیکن دراصل اس سے ان کا مقصد یہ ہے کہ امریکہ انھیں چین اور روس کی طرف متوجہ دیکھکر زیادہ سے زیادہ امداد دے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کو ترقی یافتہ ملک بننے کیلئے جس امداد کی ضرورت ہے وہ اسے امریکہ سے ہی مل سکتی ہے، اور وہ لے بھی رہا ہے لیکن وہ اس طریق سے لے رہا ہے کہ اس کا وقار خطرے میں نہ پڑے اور امریکہ اسکی قیادت کیلئے بھی راستہ صاف کرتا جائے۔ ٹرومین کے عہد حکومت میں تو امریکہ نے ہندوستان کی خوشامد کی۔ اسکی وجہ ظاہر تھی چین کے بعد امریکہ ہندوستان میں ہی کمیونزم کے سیلاب کے سامنے بند باندھ سکتا تھا۔ لیکن صدر آئزن ہاور کی آمد سے امریکہ کی پالیسی میں تبدیلی آگئی ہے۔ اس نئی حکومت کے اقدامات واضح اور دوٹوک ہوتے جا رہے ہیں۔ انھوں نے جب یہ دیکھا کہ ہندوستان ان کی مدد کے زور پر اپنی قیادت کیلئے تیاری کر رہا ہے تو انھوں نے محسوس کر لیا کہ وہ اس گھوڑے پر بازی نہیں لگا سکتے۔ امریکہ کا یہ فیصلہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ ہندوستان امریکہ کی تائید سے محروم ہو جائیگا تو کمیونسٹ حلقوں میں بھی اسکی قدر و منزلت کم ہو جائیگی۔ بین الاقوامی سیاست میں پنڈت نہرو نے دولِ عظمیٰ کی باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا اور مبنی بنیادوں پر اپنی پوزیشن بنانے کی کوشش کی تھی۔ یہ بنیادیں اب ختم ہوتی نظر آتی ہیں۔ اس سے پنڈت نہرو کا وقار خطرے میں پڑ گیا ہے۔ ان کی خارجہ پالیسی ناکام ثابت ہو رہی ہے۔

پاکستان کیلئے موقع پاکستان اس ناکامی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے کیونکہ اب اسے موقع میسر آیا ہے کہ وہ بین الاقوامی سیاست میں اپنا مقام حاصل کرے۔ اب تک ہندوستان کی چالوں اور اپنی کم فہمی یا غلط بینی کی بنا پر ہم بے یار رہے ہیں۔ کشمیر کے معاملہ میں اقوام متحدہ میں ہماری ناکامی کی اصل وجہ یہی ہے کہ ہم اپنے حق میں ووٹ لینے سے قاصر رہے۔ یوں تو ہم بھی اقوام سے دوستی کا دم بھرتے رہے اور دوسری اقوام بھی ہمیں اپنی دوستی کا یقین دلاتی رہیں، ان کے اخبارات بھی ہمارے حق میں مضامین لکھتے رہے لیکن جب رائے شماری کا وقت آتا رہا تو ہمارے بہت سے "دوست" ہندوستان کے حق میں ووٹ دیتے رہے۔ یہ ہماری خارجی پالیسی کی ناکامی ہے۔ خارجی پالیسی اندرونی پالیسی سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی بقول بعض یہ اسی کی توسیع ہوتی ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ ہم اچھی طرح جان لیں کہ ہماری ضروریات کیا ہیں۔ ہندوستان کی مخالفت کے پیش نظر ہماری اولیں ضرورت ہے کہ ہم فوجی لحاظ سے مستحکم ہوں۔ کوئی کمزور قوم آجکل کی دنیا میں باعزت طور پر جی نہیں سکتی۔ یہ فوجی قوت ہم اپنے ذرائع سے مہیا نہیں کر سکتے۔ پاکستان غریب ملک ہے اور تنہا اعلیٰ فوجی طاقت نہیں بن سکتا۔ یہ مدد بحالات موجودہ روس سے نہیں مل سکتی۔ نیز یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جو ملک روس سے امداد خواہ ہوئے ہیں انھیں کمیونزم کا شکار ہونا پڑا ہے۔ کمیونزم کا شکار ہو کر فوجی امداد حاصل کرنا ایک مسلمان مملکت کیلئے بہر حال مہنگا سودا ہے۔ اسکے مقابلے میں امریکہ سے خاطر خواہ مدد مل سکتی ہے۔ اس سے ہمارے دوستانہ مراسم بھی ہیں اور اس سے سات لاکھ ٹن گندم مفت لے چکے ہیں۔ گندم کی اتنی وافر مقدار ہمیں خریدنا پڑتی تو ہمارا باقی کاروبار بند ہو جاتا۔ اندریں حالات ہمیں زندہ رہنے کیلئے فوجی مدد لینا ہی پڑیگی۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس مدد کیلئے آزادی کی قیمت دینا ہوگی۔ لیکن دیکھا جائے تو آزادی کی قیمت دینا یا نہ دینا ہمارے اختیار میں ہے۔ ایسی مدد آزادی برقرار رکھتے ہوئے بھی لی جا سکتی ہے، اور اسی طرح سے ہمیں یہ مدد لینی چاہیئے۔

ہماری دوسری ضرورت ملک سے افلاس دور کرنے کی ہے۔ یہ ضرورت بھی بغیر غیر ملکی امداد کے پوری نہیں کی جا سکتی۔ اگر پاکستان کا فوجی بجٹ کسی طریق سے کم ہو جائے تو زیادہ روپیہ معاشی ترقی کیلئے صرف کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ سے فوجی مدد ملنے کی صورت میں ایسا کرنا بھی ممکن ہو جائیگا۔ پاکستان ہشیاری سے کام لے تو اس سے اور فوائد

بھی حاصل کر سکتا ہے جو بالآخر اس کے عزائم کی تکمیل میں مدد دے سکتے ہیں۔ اول تو یہ کہ اس طرح بین الاقوامی اداروں میں پاکستان ووٹ حاصل کر سکے گا اور یکہ و تنہا نہیں رہیگا۔ اس کا اثر کشمیر کے مسئلہ پر پڑ سکتا ہے۔ دوم یہ کہ اپنے استحکام کی طرف سے اطمینان حاصل ہو جانے کے بعد ہم عالم اسلامی کی بیداری اور استحکام کا بہتر انتظام کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو نہ محض اپنی آزادی برقرار رکھ سکیں گے بلکہ تمام عالم اسلامی کو آزاد و مضبوط بنا کر ایک مستحکم بلاک میں بدل سکیں گے جو متخاصم قوتوں میں توازن برقرار رکھ سکے گا اور امن عالم و فروغ انسانیت کی دلیل بن جائے گا۔

وزیر اعظم پاکستان نے تازہ اخباری ملاقات میں اس "فوجی امداد" کی گفتگو کی حقیقت بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ امریکہ سے عمومی اور رسمی گفتگوئیں ہوئی ہیں، جن کی تفاصیل ابھی تک زیر بحث نہیں آئیں۔ گفتگوؤں کا مقصد یہ ہے کہ ہم دفاعی فوجی ساز و سامان مدد کے طور پر حاصل کریں۔ یہ مدد کسی پر حملہ کرنے کی نیت سے حاصل نہیں کی جائیگی اور نہ ہم کسی ملک کو اڈے استعمال کرنے کی اجازت دے رہے ہیں۔ یوں تو اس سے معترضین کو خاموش ہو جانا چاہئے تھا لیکن ہندوستان کو جو زک اٹھانا پڑ رہی ہے اس کے پیش نظر اسکی خاموشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہندوستانی کانگرس نے تو یہانتک احکام صادر کر دیئے ہیں کہ ماتحت کانگرس کمیٹیاں رائے عامہ کو تیار کریں۔ یہ انتہائی غیر ذمہ دارانہ اور غیر معمولی اقدام ہے کسی ملک نے کسی دوسرے ملک کی خارجہ پالیسی کے خلاف اتنا اہتمام کبھی نہیں کیا۔ اسکی دو وجہیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ ایسے مظاہروں سے ہندوستان کے بقیہ مسلمانوں کو بھی وہاں سے بھگایا جائے تاکہ پاکستان پر اور بوجھ پڑے۔ دوسرے یہ کہ— جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے— پنڈت نہرو کے وقار کو بین الاقوامی سیاست میں جو صدمہ پہنچا ہے اس کو اندرون ملک اس طریق سے بحال کیا جائے۔ دونوں صورتیں ایسی ہیں کہ ہندوستان خاموش نہیں رہ سکے گا۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ امریکہ کے ارباب حل و عقد اس شور و غل سے زیادہ متاثر نہیں ہو رہے اور وہ اس کا فیصلہ معاملہ کے مالہٗ و ماعلیہ کے مطابق کرنے کے متمنی ہیں۔ انہی دنوں امریکہ کے سفیر متعینہ نئی دہلی نے اس معاملہ پر اپنے ملک کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی اور صاف طور پر کہا کہ ہم ہر چند ہندوستان کے اعتراضات کو پیش نظر رکھیں گے لیکن کسی ملک کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے ممالک کے معاملات میں خواہ مخواہ دخیل ہو۔

امریکہ ہندوستان کی غوغا آرائی سے متاثر ہو یا نہ ہو، روس اور چین اسکے ضرور ہمنوا ہو رہے ہیں۔ چنانچہ دونوں ممالک نے یہ جانے بغیر کہ کیا ہو رہا ہے پاکستان کو اس "فوجی معاہدے" کے خلاف احتجاج ارسال کر دیا ہے۔ روس نے یہ بھی کہا ہے کہ غیر ملکی توپوں سے آزادی برقرار نہیں رکھی جا سکتی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ہندوستان کو فوجی امداد پیش کی ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر امریکہ کی توپوں سے پاکستان اپنی آزادی برقرار نہیں رکھ سکے گا تو روسی توپوں سے ہندوستانی آزادی کیسے محفوظ رہ سکتی ہے؟

یہ ہے اسوقت کی صورت حالات جب کہ نہ صرف پاکستان کے مسلمان بلکہ تمام دنیا کے مسلمان اپنی حفاظت اور استحکام کیلئے خارجی امداد کے محتاج ہیں۔ اگر مسلمان اپنے خدا کے بتائے ہوئے نظام ربوبیت پر چلتے (جسکی رو سے رزق کے سرچشمے تمام نوع انسانی کیلئے یکساں طور پر کھلے رہتے ہیں) تو نہ صرف یہ کہ انھیں اپنی حفاظت کیلئے کسی کی مدد کی احتیاج نہ ہوتی انھیں ایسی بین الاقوامی اہمیت حاصل ہوتی کہ دنیا بھر کی قومیں اپنی حفاظت کیلئے انکی طرف دیکھتیں۔ ان کے خدا نے ان کا مقام اُمّۃً وسطاً تجویز کیا تھا یعنی بین الاقوامی پوزیشن رکھنے والی قوم۔ اور ان کا منصب قرار دیا تھا شُہَدَاءَ عَلَی النَّاس یعنی تمام نوع انسانی کے اعمال کی نگران۔ اور اس کا ذریعہ بتایا تھا خدا کی صفت ربّ العالمین کا مظہر بننا۔ یعنی تمام نوع انسانی کی ربوبیت کا ذمہ دار ہونا——— لیکن جو قوم ۔ ۔ ۔ ات کو چھوڑ دے اسے یقیناً دوسروں کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ سوال جذبات میں الجھنے کا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ بحالات موجودہ' پاکستان' کم از کم قیمت ادا کر کے زیادہ سے زیادہ سامان حفاظت و استحکام کس طرح اور کہاں سے حاصل کر سکتا ہے۔ اس مسئلہ کو اسی نگاہ سے جانچنا اور اسی کے مطابق اس کا فیصلہ کرنا چاہئے۔

———

ادارۂ طلوعِ اسلام کی مطبوعات ایک نظر میں

معراجِ انسانیت — ترجمانِ حقیقت جناب پرویز کا قلم اور سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام خود قرآن کے آئینے میں۔ جو اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ ابتدا میں قریب پونے دو سو صفحات پر دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریب نو سو صفحات۔ کاغذ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط و حسین۔ گردپوش مرصع و دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش و رنگین۔ قیمت بیس روپے (علاوہ محصولڈاک)

نوادرات — علامہ حافظ محمد اسلم صاحب کے نادر مضامین کا قابل قدر مجموعہ۔ ضخامت چار سو صفحات قیمت چار روپے۔ (علاوہ محصولڈاک)

اسلامی نظام — دورِ حاضر کی ایک بلند پایہ کتاب جس میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت کے نظام اور آئین کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ وہ نظام آج کس طرح قائم ہو سکتا ہے اس میں محترم پرویز صاحب اور علامہ محمد اسلم جیراجپوری کے وہ مقالات شامل ہیں جنہوں نے قوم کے سنجیدہ طبقہ کے سامنے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات مجلد مع گردپوش۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصولڈاک)

قرآنی دستورِ پاکستان — آئینی جدوجہد کے سلسلہ میں ادارۂ طلوعِ اسلام کی پیشکش۔ قرآن کی روشنی میں مسودات قراردادِ مقاصد و بنیادی اصول و حقوق جو حکومت کے اعلان کے جواب میں بھیجے گئے۔ ساتھ ہی حکومت کی جانب سے پاس کردہ قراردادِ مقاصد اور بنیادی اصولوں کی پہلی رپورٹ پر قرآن کی روشنی میں تنقید۔ مولوی صاحبان کے بائیس نکات کا تجزیہ۔ اسلامی جماعت کی دستوری سفارشات پر تبصرہ۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات مجلد مع گردپوش قیمت دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)

اسبابِ زوالِ امت (مصنفہ) — دورِ حاضرہ کی انقلاب آفریں کتاب۔ مختصر مگر ہماری ہزار سالہ تاریخ کا نچوڑ جس نے قوم کے سنجیدہ تعلیمیافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ صحیح طور پر بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا؟ ضخامت ۱۵۰ صفحات مجلد طلائی گردپوش قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ (علاوہ محصولڈاک)

تین اہم عنوانات — مُلّا کے مذہب کے عجیب غریب حقائق مثلاً (۱) تبدیلِ مذہب کرنے والوں کو قتل کر دیا جائے گا۔ (۲) غلام اور لونڈیاں بے حد و نہایت بلا نکاح حرم سراؤں کی زینت بنائی جاسکیں گی۔ (۳) یتیم پوتوں کو وراثت سے محروم رکھا جائیگا۔ قرآن کی روشنی میں مُلّا کے خود ساختہ مذہب کا ابطال اور ان تینوں مسائل کا حل اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمایئے۔ ضخامت ۲۱۲ صفحات قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔

سلیم کے نام خطوط — محترم پرویز صاحب کے قلم سے۔ ہمارے نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق جس قدر شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت شگفتہ شاداب اور سائنٹفک انداز میں تسکین بخش جواب۔ عقائد و نظریات جیسے خشک اور نازک مسائل پر اس عمدگی سے بحث کی گئی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور معرکہ آرا مسائل حل کر کے رکھ دیئے گئے ہیں جنہیں ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ضخامت بڑے سائز کے ۴۲۵ صفحات۔ مجلد مع حسین گردپوش۔ قیمت چھ روپے (علاوہ محصولڈاک)

ہماری بصیرت کے مطابق قرآنی فیصلے — دورِ حاضرہ کی ایک اہم کوشش جس میں روزمرہ زندگی کے تقریباً ساٹھ اہم مسائل و معاملات کے متعلق قرآن کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان مسائل اور معاملات میں قرآن کا کیا فیصلہ ہے۔ یہ کتاب آپ کو دوسرے سہاروں سے بے نیاز کر دیگی۔ ضخامت ۴۰۸ صفحات۔ قیمت مجلد مع گردپوش چار روپے (علاوہ محصولڈاک)

جشن نامے — بلند حقائق کا مجموعہ اور عبرت و موعظت کا مرقع۔ ایسے ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر بیک وقت آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو آجائیں۔ طنز و تنقید کے ایسے گہرے نشتر اثر و درد کے ایسے خونچکاں منظر شاید ہی کہیں مل سکیں یہ کتاب ہمارے چھ سالہ دورِ آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ ہے ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت مجلد مع گردپوش دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصولڈاک)۔

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ کوی روڈ۔ (صدر) کراچی